دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۵ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۱۰ء عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

سلیم سلیم سلیم

شذرات

دارالمصنفین میں تیار ہونے والے لٹریچر کی طباعت اور اشاعت کا اہتمام اس کی تاسیس کے مقاصد میں ابتداء ہی سے شامل رہا ہے، یہاں پریس کا قیام اس کی بنیادی ترجیحات کا ایک حصہ تھا۔ اکیڈمی میں پریس ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا اور شروع ہی سے معارف پریس کے نام سے جانا گیا۔ پریس قائم ہونے سے پہلے اکیڈمی کی دو کتابیں مکاتیب شبلی حصہ اول اور ارض القرآن حصہ اول شائع ہو چکی تھیں۔ پریس نے ۹/جون ۱۹۱۶ء سے کام کرنا شروع کیا اور یہاں سے پہلی چھپنے والی کتاب مکاتیب شبلی حصہ دوم تھی۔ جولائی ۱۹۱۶ء سے معارف کی اشاعت شروع ہوئی اور ۹۴ برسوں پر محیط علم و دانش کا یہ سفر اب بھی جاری ہے اور ''امید کا یہ چراغ اب بھی روشن ہے''۔ سیرت النبیؐ کی پہلی جلد اگست ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ اسی سال ارض القرآن کی دوسری جلد شائع ہوئی۔ سیرت النبیؐ کی دوسری جلد ۱۹۲۲ء میں اور تیسری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس سلسلۃ الذہب کی دوسری کڑیاں وقفہ وقفہ سے منظر عام پر آتی رہیں، ساتھ ہی دوسری تحقیقات بھی شائع ہوتی رہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس عظیم الشان لٹریچر کی تشکیل ہوئی جو ہماری علمی میراث کا ایک گراں مایہ حصہ ہے اور جس نے ہماری کئی نسلوں کی علمی اور تہذیبی تربیت اور ان کے لیے فکری غذا فراہم کرنے کے میدان میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

دارالمصنفین کی مطبوعات نے نہ صرف علم و تحقیق کے میدان میں ایک نیا معیار قائم کیا بلکہ اردو مطبوعات کی تاریخ میں کتابت، طباعت اور پیشکش کے نقطۂ نظر سے اپنا ایک ممتاز اور منفرد مقام بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ اگر اس وقت کے مخصوص حالات خصوصاً جنگ کی وجہ سے کاغذ کی شدید کمیابی بلکہ نایابی کو ذہن میں رکھا جائے تو دارالمصنفین نے جس انداز اور معیار پر خاص طور سے سیرت النبیؐ کے ابتدائی ایڈیشنوں کو شائع کیا اسے غیر معمولی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اکیڈمی کے ابتدائی دور کی کتابیں حسنِ سادہ کا بڑا دلکش نمونہ پیش کرتی ہیں۔ چنانچہ علم و دانش کی دنیا میں مطبوعات دارالمصنفین کی جو شناخت قائم ہوئی علم و تحقیق کی رفعت اور اسلوب بیان کی دلآویزی کے ساتھ ساتھ اس کا ایک اہم جزء کتابت اور طباعت کا اعلیٰ معیار بھی تھا۔ یہ معیار ایک عرصہ تک قائم رہا۔ اکیڈمی کی کتابوں کو جو حسن قبول حاصل ہوا اس میں اس کا بھی ایک حصہ تھا۔ اکیڈمی کے موجودہ حالات کے تناظر میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب صرف رحمت عالمؐ کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے دارالمصنفین نے

ندوۃ العلماء کے تعمیر فنڈ میں قریب چار ہزار روپیہ کا عطیہ دیا۔ ۱۹۴۰ء میں یہ یقیناً ایک گراں قدر رقم تھی۔ لیکن گردش ایام کی دست برد سے کون بچا ہے۔ ملک کی تقسیم نے اسے اپنے قدر دانوں کے ایک بڑے حلقے سے محروم کردیا۔ آزادی کے بعد اردو جن مسائل اور مصائب سے دوچار ہوئی ان کے اثرات سے یہ ادارہ کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ ان عوامل کی کارفرمائی سے دوسرے شعبوں کے علاوہ اس کی مالیات خاص طور سے متاثر ہوئی۔ نتیجہ کے طور پر کتابوں کی اشاعت کا وہ معیار باقی رکھنا ممکن نہ رہا جو اس کی شناخت بن چکا تھا۔ اکیڈمی کے مالی استحکام کا انحصار بڑی حد تک کتابوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر تھا۔ اس کی وجہ سے اکیڈمی کی مالی پوزیشن مزید عدم استحکام کی شکار ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں طباعت کا معیار مزید متاثر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طباعت کا فن انقلابی تبدیلیوں سے گذر رہا تھا۔ اکیڈمی نہ صرف یہ کہ طباعت کے میدان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے فائدہ نہ اٹھا سکی بلکہ اس کے لیے خود اپنے قائم کیے ہوئے معیار کو باقی رکھنا ممکن نہیں رہ گیا۔ اکیڈمی کی کتابوں کی طلب بدستور موجود تھی لیکن شائقین ان کو نئے انداز اور معیار پر چاہتے تھے۔ اور اکیڈمی کے وسائل اس کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ ان حالات کا بھرپور فائدہ ان اداروں نے اٹھایا جو کسی ضابطہ اخلاق پر یقین نہیں رکھتے اور جن کا مطمح نظر صرف جلب منفعت ہے۔ ان اداروں نے جن کے نام اور چہرے جانے پہچانے ہوئے ہیں اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور اکیڈمی کی زیادہ مقبول کتابوں کے ایڈیشن پر ایڈیشن شائع کرتے چلے گئے۔ اس کے جو اثرات اکیڈمی کی مالیات پر پڑے ان کے ادراک کے لیے بہت زیادہ ژرف نگاہی کی ضرورت نہیں ہے۔

مارچ ۲۰۰۸ء کے اواخر میں جب اس عاجز نے یہ گراں بار ذمہ داری سنبھالی تو مطبوعات کا شعبہ دوسرے شعبوں سے زیادہ خستہ حالی کا شکار تھا۔ مطبوعات کی ایک خاصی بڑی تعداد دوبارہ اشاعت کی منتظر تھی۔ جو کتابیں موجود تھیں ان میں سے بیشتر اس حالت میں نہ تھیں کہ انہیں قدر دانوں کے سامنے پیش کیا جاسکے یا بازار میں مسابقت کی جنگ جیت سکیں۔ ایسے گراں بہا اور ایسے حیات بخش لٹریچر کی اس کس مپرسی پر دل لرز گیا۔ جانے کتنے ذہنی ہفت خوانوں سے گذرنے کے بعد جب اس عظیم ملی ادارہ کی تعمیر نو کا منصوبہ بنایا گیا تو فطری طور پر اکیڈمی کی شہرۂ آفاق کتابوں کی وقت کے تقاضوں کے مطابق طباعت اس کی ترجیحات میں سرفہرست تھی۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ اکیڈمی کی تمام کتابوں کو اولین فرصت میں بہترین انداز اور اعلیٰ ترین معیار پر شائع کیا جائے کہ وہ اسی کی حق دار ہیں لیکن دستیاب مالی اور افرادی

وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت کے حالات کے پس منظر میں یہ دیوانے کا خواب ہی معلوم ہوتا تھا اور خواہش اور حقیقت واقعہ کا درمیانی فاصلہ یکسر نا قابل عبور نظر آتا تھا۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

سیرت نبویؐ کے اس خدمت گزار ادارے پر اللہ تعالیٰ کے جو بے پایاں انعامات ہیں اور جن کی شکر گذاری کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ان کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ وسائل کی قلت اور مسائل کی کثرت کے باوجود اب تک جو کتابیں نئے انداز اور معیار پر شائع کی جا چکی ہیں ان کی تعداد پچاس کے قریب پہنچ رہی ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: الفاروق، المامون، سوانح مولانا روم، خطبات شبلی، مقالات شبلی کی دو جلدیں، حیات شبلی، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، اقبال کامل، شعر الہند حصہ اول، خلفائے راشدین، تاریخ کشمیر، اسلام میں مذہبی رواداری، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری تین حصے، اردو غزل، خیّام، سیرت عائشہؓ اور دولت عثمانیہ وغیرہ۔ خواہش تو یہ تھی کہ اب جو کتابیں شائع ہوں، ان میں اشاریہ اور کتابیات کا اضافہ ضرور کر دیا جائے لیکن سر دست تمام کتابوں کے سلسلہ میں یہ ممکن نہیں ہو پا رہا ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اولین فرصت میں کتابوں کو شائع کر دیا جائے تا کہ وہ شائقین کو دستیاب ہو جائیں۔ اگلے مرحلہ میں انشاء اللہ ان امور کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔

کچھ برس پہلے اکیڈمی نے سیرت النبیؐ کا ایک معیاری اور دیدہ زیب ایڈیشن شائع کیا تھا۔ بازار میں سستے ایڈیشنوں کی موجودگی کے باوجود اب یہ ایڈیشن تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس وقت وابستگان دار المصنفین کی پوری توجہ نئے ایڈیشن کی تیاری پر مرکوز ہے۔ امکانی حد تک کوشش کی جا رہی ہے کہ پہلے ایڈیشن میں راہ پا جانے والی کمیوں کا ازالہ کیا جا سکے۔ اس ایڈیشن کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں اہل علم کی تجاویز اور رائیں ہمارے لیے مشعل راہ ہوں گی۔ خواہش اور کوشش یہ ہے کہ اکیڈمی کی اس اہم ترین اور مقبول ترین کتاب کو جو اس کے لیے سرمایہ افتخار ہے، اسی آب و تاب سے شائع کیا جائے۔ یہ ایک بڑے بجٹ کا منصوبہ ہے اور اس میں شرکت باعث سعادت ہے۔ سیرت النبیؐ یا اکیڈمی کی باقی تقریباً دو سو کتابوں کے سلسلہ میں جو ابھی اشاعت کی منتظر ہیں، ہر طرح کے تعاون کا صمیم قلب سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ اسی طرح اکیڈمی کی کتابوں کے انگریزی اور ہندی تراجم کے منصوبہ کے لیے قدر دانانِ دار المصنفین کے بھر پور تعاون کی اشد ضرورت ہے۔

مقالات

غزوۂ بدر میں صحابہ کرامؓ کے مشورہ کی ایک روایت پر نقد و نظر

پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی

اہل سیر اور محدثین کرام دونوں کا اتفاق ہے کہ رسول اکرمؐ نے غزوۂ بدر سے قبل مشورہ فرمایا، صحابہ کرام سے مشورہ کا موقع یہ تھا کہ آپؐ تین سو تیرہ جاں نثاروں کا ''قافلہ'' قریش کے کاروان تجارت کو روکنے کے لیے لے کر نکلے تھے۔ مدینہ منورہ سے باہر کئی منزلیں طے کرنے پر خبر ملی کہ قریشی کاروان تجارت تو نکل گیا۔ اب اس کاروان قوم کی حفاظت کے لیے مکہ مکرمہ سے آنے والے ہزار نفری اور ہر طرح سے لیس لشکر کا سامنا ہے۔ حضرات صحابہ کرام سے اس مشکل موقع پر مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے، سب کا عزم مصمم تھا کہ لشکر کا مقابلہ کرنا چاہیے، اس موقع خاص پر حضرت مقداد بن عمرو بہرانی قضاعیؓ نے عرض کیا ''ہم وہ بات نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ اے موسیٰ! تم جاؤ اور تمہارا رب، تم دونوں لڑو، ہم تو یہیں کے (کذا) بیٹھے ہیں بلکہ (اے اللہ کے رسولؐ) آپ (جنگ کے لیے نکلیے) ہم آپؐ کے ساتھ ہیں، ہم آپؐ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف لڑیں گے۔ رسول اللہؐ اس تقریر سے بہت خوش ہوئے، خوشی سے آپؐ کا چہرہ چمکنے لگا''۔

جناب مسعود احمد کا اردو ترجمہ بخاری کی حدیث ۳۹۵۲ کا ہے اور اس کا متن حسب ذیل ہے:

۳۹۵۲- حدثنا ابو نعیم حدثنا اسرائیل عن مخارق عن طارق بن شهاب قال:

ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

فسمعت ابن مسعود يقول : شهدت من المقداد بن الاسود مشهداً لان اكون صاحبه احب الى مما عدل به : اتى النبیؐ وهو يدعو على المشركين فقال : لا نقول كما قال قوم موسى ، اذهب انت وربك فقاتلا (المائدہ: ۲۴)ولكنا نقاتل عن يمينك وعن شمالك وبين يديك وخلفك فرايت النبیؐ اشرق وجهه وسره يعنى قوله (بخاری، کتاب المغازی، باب قول اللہ تعالیٰ: اذ تستغيثون ربكم الخ؛ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، مکتبہ دارالسلام ریاض ۱۹۹۷ء، ۷/ ۳۵۸ - ۳۶۰ ومابعد؛ حدیث ۳۹۵۲ کا ایک طرف: ۴۶۰۹ میں بھی ہے اور دیگر کتب حدیث میں بھی، مسعود احمد، صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین، ادارہ اشاعت دینیات (پرائیویٹ) لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۰۰۷ء، ۱/ ۳۳۵؛ متن وسند حدیث میں راوی صحابی کا اسم گرامی حضرت مقداد بن اسودؓ ہے مگر ان کے والد کا اصل نام عمرو تھا جو قبیلہ قضاعہ کی شاخ بہراء سے متعلق ہونے کے سبب بہرانی قضاعی کہلاتے تھے، یہ اصابہ ابن حجر نمبر ۸۱۸۵ اور ابن اثیر کی اسد الغابہ ۴/ ۴۰۹ ومابعد کا بیان ہے۔ اس کے مطابق وہ مقداد بن الاسود کے نام سے معروف تھے کیونکہ وہ قریش ایک سردار اسود بن عبد یغوث زہری کے حلیف ومتبنی تھے، قدیم الاسلام تھے، مہاجر حبشہ ومدینہ تھے اور بدری تھے۔ انہوں نے یہ مشورہ رسول اکرمؐ کو دیا تھا یعنی حدیث بخاری ۳۹۵۲ میں مقداد بن اسود سے، یہی مہاجر بہرانی قضاعی مراد ہیں، اسد الغابہ اور اصابہ میں صرف ان ہی مقداد بن عمرو کا ذکر ہے اور کسی دوسرے ہم نام کا نہیں ہے۔ ان کو کندی اس لیے کہا جاتا ہے کہ کندہ سے ان کا حلف کا معاہدہ تھا، مسعود احمد نے اپنی صحیح تاریخ الاسلام کا تذکرۂ صحابہ میں ان کو انصاری بنا کر نسب لکھا ہے: حضرت مقداد بن عمرو اسود کندی انصاری ۲/ ۴۲۹ - ۴۳۰ اور جنگ بدر کے حوالے سے ان کی اس حدیث کا ذکر بخاری مذکورہ بالا اور دوسرے ابواب کے حوالے سے ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں اسم گرامی مقداد بن عمرو الکندی لکھا ہے جیسا کہ آگے ان کا ذکر خیر بعض روایات کے حوالے سے آرہا ہے لیکن کندی کی نسبت صرف حلف کے معاہدہ کی وجہ سے ہے اور وہ انصاری تو کسی طور نہ تھے۔ تمام روایات وتذکرے ان کو مہاجرین میں شمار کرتے ہیں۔

امام بخاری نے حضرت مقداد بن عمرو بہرانی قضاعیؓ کی اس حدیث کا ذکر دوسرے ابواب میں بھی کیا ہے اور دوسرے محدثین کرام کے ہاں بھی ملتا ہے جیسا کہ فتح الباری اور دوسرے اہل سیر

وغیرہ کے مباحث عالیہ میں موجود ہے۔ ان روایات و احادیث کا ذکر کچھ دیر بعد آتا ہے کہ اس حدیث مقداد کے مقامات و مواقع بھی مختلف و متعدد ہیں۔ بہرحال امام سیرت محمد ابن اسحاق اور ان کے مرتب و مہذب امام ابن ہشام نے بھی حضرت مقداد کے اس مشورہ کا ذکر اپنی اپنی روایات میں کیا ہے۔ ان میں بھی بعض مواقع و مقامات کا اختلاف ملتا ہے اور بعض اور مسائل بھی پائے جاتے ہیں۔

قدیم ترین ماخذ سیرت حضرت عروہ بن زبیر کی مغازی میں بھی یہ روایت و مشورہ حضرت مقداد بن عمرو عدید بنی زہرہ میں موجود ہے: انا لا نقول لك كما قال اصحاب موسى : فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قعدون (المائدہ۔ ۲۴) و لكن اذهب ...... الخ۔ مرتبہ محمد مصطفیٰ اعظمی، ۱۳۶)

ابن اسحاق، ابن ہشام نے سورۂ مائدہ - ۲۴ کا حوالہ دیا ہے مگر ابن سعد کی روایت میں قوم موسیٰ اور سورہ کا حوالہ نہیں ہے، السیرۃ النبویۃ ۱۹۹۶ء، ۱/ ۴۸ میں ہے) مطبعۃ مصطفیٰ البانی مصر ۱۹۵۵ء، القسم الاول، ۶۱۵، الطبقات الکبری دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء، ۲/ ۱۴؛ واقدی، کتاب المغازی، آکسفورڈ پریس۔

ابن اسحاق کی روایت دوسرے اہل سیر نے بھی نقل کی ہے۔ ان میں امام ابن سید الناس (محمد بن عبداللہ، م ۷۳۴) بھی شامل ہیں۔ اس میں مقام مشاورت زفران نامی وادی ہے جو عرق الظبیہ سے آگے تھی۔ اس میں بنو اسرائیل کا مقالہ منقول ہے۔ ابن اثیر نے سورہ و قوم موسیٰ کا حوالہ دیا ہے اور برک الغماد تک جانے کا ذکر کر کے اسے مدینۃ الحبشہ قرار دیا ہے جب کہ حافظ ابن کثیر نے بخاری، نسائی، احمد کی احادیث کی بنا پر اس سورہ اور قوم موسیٰ کا حوالہ دیا ہے لیکن امام مسلم کی احادیث میں اس کے ذکر کی نفی کی ہے۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، دار صادر بیروت ۱۹۶۵ء، ۲/ ۱۲۰؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مطبعہ السعادہ قاہرہ ۱۹۳۲ء، ۳/ ۲۶۲؛ ابن سید الناس، عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر، موسسۃ عز الدین بیروت ۱۹۸۶ء ۱/ ۲۴۷؛ نیز ملاحظہ ہو بلاذری، انساب الاشراف، دار المعارف مصر ۱۹۵۹ء، ۱/ ۲۹۳ و مابعد نے دو مواقع بیان کیے ہیں: اول صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت مقداد نے یہ مقالہ مسلمانوں کے جنگ کی تیاری کے وقت کہا تھا اور ضعیف روایت یہ ہے کہ بدر کی طرف مسلمانوں کے خروج کا حکم نبوی ملنے کے بعد عرض کیا تھا۔

حضرت عروہ، امام ابن اسحاق، ابن ہشام اور امام بخاری وغیرہ بنیادی مآخذ سے بعد کے تمام اہل سیر نے اس کو نقل کیا ہے، ان میں تمام متقدمین و متاخرین سیرت نگار بھی شامل ہیں، بعض جامع محدثین اور ان کے شارحین کرام بھی شامل ہیں اور بعد کے متاخرین اہل سیر و اہل حدیث بھی نقل در نقل کی سعادت رکھتے ہیں۔ ان میں عربی اردو کے عبقری سیرت نگار بھی شامل ہیں۔ سورۂ انفال اور غزوۂ بدر سے متعلق آیات کریمہ کی تشریح و تعبیر میں بعض مفسرین و مترجمین نے اس کو نقل کیا ہے، اسی طرح سورہ مائدہ - ۲۴ کی تشریح و تفسیر میں بھی متعدد مفسرین کرام نے غزوۂ بدر کے موقع پر اس کے نقل کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے مثلاً اسی زیر بحث آیت کریمہ کی تفسیر میں رسول اکرمؐ کی غزوۂ بدر کے مرحلۂ آزمائش پر صحابہ کرام سے مشورہ اور حضرت مقداد بن عمرو کندیؓ کے مشورے اور اس میں قوم موسی کے قول کے ساتھ اسی آیت کریمہ کی روایات مسند امام احمد بن حنبل، صحیح ابن حبان اور صحیح بخاری کی سند پر نقل کی ہیں۔ حضرت عتبہ بن عبید سلمی کی سند پر مروی حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی صحابہ کرام نے آیت کریمہ کا مذکورہ ٹکڑا پڑھا تھا اور حضرت مقداد جیسا جواب بھی دیا تھا: قال النبیؐ لا صحابه ، الا تقاتلون ؟ قالوا : نعم و لا نقول كما قالت بنو اسرائيل لموسى اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُوۡنَ ...... الخ (تفسیر القرآن، ۲/ ۳۸ - ۳۹؛ بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ المائدہ، حدیث ۴۶۰۹، میں بھی غزوۂ بدر میں ہے حضرت مقداد کے اس مقولہ کا مقام بتایا گیا ہے: قال المقداد يوم بدر الخ، فتح الباری ۸/ ۳۴۵ - ۳۴۶؛ متعدد دوسرے مفسرین نے بھی اس مقالہ حضرت مقداد کا حوالہ اپنی اپنی تفاسیر میں دیا ہے، جیسے طبری (محمد بن جریر)۔ (طبری، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، تفسیر الطبری، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۲۰۰۱، ۵/ ۲۲۶: بدر اور حدیبیہ دونوں مواقع پر حضرت مقداد کے اس قول کی دو روایات دی ہیں۔

عہد جدید کے قابل قدر سیرت نگار اکرم ضیاء عمری جن کا دعوی ہے کہ ان کی سیرت صحیحہ صرف احادیث پر مشتمل ہے ابن اسحاق سے صحیح سند پر اس مشاورت کی بحث نقل کی ہے۔ اس میں حضرت مقداد بن عمرو کا مذکورہ بالا قول ان ہی سے منقول ہے۔ (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: ۳۵۴ و ماقبل) اردو سیرت نگاروں کا جلیل القدر طبقہ بھی اس حدیث مقداد کو اپنی اپنی کتب میں ضرور نقل

کرتا ہے، مولانا شبلی نعمانیؒ رقم طراز ہیں: ''بخاری میں ہے کہ حضرت مقداد نے کہا کہ ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں، ہم لوگ آپ کے داہنے سے بائیں سے سامنے سے پیچھے سے لڑیں گے، ان کی اس تقریر سے رسول اللہؐ کا چہرہ چمک اٹھا''۔ (سیرۃ النبی، اعظم گڈھ، مطبعہ معارف ۱۹۸۳ء، ۱/ ۳۲۶)، قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ فرماتے ہیں کہ ''مقداد نے کہا: یارسول اللہ! ہم وہ نہیں کہ قوم موسیٰ کی طرح'' اذهب انت وربك فقاتلا انا هاهنا قاعدون کہہ دیں کہ ہم تو حضورؐ کے داہنے، بائیں، آگے پیچھے قتال کے لیے حاضر ہیں''۔ (رحمۃ للعالمین، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۰ء، ۱/ ۱۰۳-۱۰۴ بحوالہ زاد المعاد، ص ۳۴۷، ترجمہ آیت یہ ہے: جا تو اور تیرا خدا دونوں لڑو، ہم تو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ حاشیہ نمبر ۱) مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی عبارت ہے: حضرت مقداد نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ہم بنی اسرائیل نہیں ہیں جنھوں نے اپنے نبی موسیٰؑ سے کہا تھا'' اذهب انت وربك فقاتلا انا هاهنا قاعدون ''۔ ہم آپ کے غلام ہیں اور آپ کے داہنے بائیں، آگے پیچھے ہر طرف نثار ہوجانے کے لیے تیار ہیں ...... (اصح السیر، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند طبع جدید غیر مورخہ، ۸۶) مولانا مرحوم نے حضرت مقداد کے بارے میں حاشیہ میں صراحت کی ہے، یعنی حضرت مقداد بن الاسود ۱۲ منہ مگر ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے) مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے حضرت مقداد بن اسود کی جاں نثارانہ تقریر کے عنوان کے تحت پہلے ابن اسحاق کی روایت نقل کی ہے اور پھر بخاری کے الفاظ کا اختلاف نقل کیا ہے۔ ان دونوں کے متون کے ساتھ ان کے اردو تراجم بھی ہیں۔ متون یہ ہیں'' امض لما امرك الله (تعالیٰ) فنحن معك والله لا نقول كما قالت بنو اسرائيل لموسى : اذهب انت وربك فقاتلا انا هاهنا قاعدون ولكن اذهب انت وربك فقاتلا انا معكما مقاتلون ۔ یہ ابن اسحاق کی روایت کے الفاظ ہیں اور بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں'' ولكنا نقاتل عن يمينك وعن شمالك وبين يديك وخلفك ...... ۔ (سیرۃ المصطفیٰ، دارالکتب دیوبند غیر مورخہ ۲/ ۶۲ بحوالہ بخاری وابن اسحاق، زرقانی وسیرۃ ابن ہشام حاشیہ نمبر ۱ میں مواقع تقریر کے اختلاف پر مولانا موصوف کی بحث ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی عربی سیرت کے الفاظ ہیں" وقال له المقداد : لا نقول لك كما قال قوم موسى لموسى "اذهب انت وربك فقاتلا انا هاهنا قاعدون" ولكنا نقاتل عن يمينك وعن شمالك ومن بين يديك ومن خلفك ...... "(السیرۃ النبویۃ، دارالشروق جدہ، طبع ہشتم ۱۹۸۹ء، ۱۷۔۲۱۷، حاشیہ نمبر ۱: زاد المعادج ۱ص ۳۴۲ - ۳۴۳ وسیرۃ ابن ہشام ق ۱ص ۶۱۴، ورواہ البخاری مختصرا فی باب قوله تعالیٰ اذ تستغيثون ربكم ......ومسلم فی باب غزوة بدر)۔دوسرے عربی سیرت نگار مولانا صفی الرحمان مبارک پوری کی عبارت ہے: ثم قام المقداد بن عمرو فقال : يا رسول الله ! امض لما اراك الله فنحن معك والله لا نقول لك كما قالت بنو اسرائيل لموسى : اذهب انت وربك فقاتلا انا هاهنا قاعدون ولكن اذهب انت وربك فقاتلا انا معكما مقاتلون فو الذى بعثك بالحق لو سرت بنا الى برك الغماد لجالدنا معك من دونه حتى تبلغه "۔(الرحیق المختوم، دارالمؤید جدہ ۱۹۹۷ء، ۲۰۹ بلاحوالہ ماخذ؛ اردو ترجمہ مجلس علمی علی گڑھ ۱۹۸۸ء، ۳۲۳ - ۳۲۴؛ اس اردو ترجمہ میں بھی اس روایت کے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں ہے)

ان مشہور و معروف اور مستند و معتبر اکابر سیرت کے علاوہ تمام دوسرے اردو سیرت نگاروں نے بھی اس حدیث حضرت مقداد کا ذکر واضح و صریح طریقے سے کیا ہے خواہ وہ ان ہی کی طرح مفصل ہو یا کچھ مختصر ہو۔(شاہ محمد جعفر پھلواروی، پیغمبر انسانیت، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۹۰ء ۲۱۸ مقام مشاورت زفران ہے؛ ابوالحسن علی ندوی، سیرت رسول اکرمؐ، سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی ۱۹۹۸ء، ۱۲۶ بحوالہ بخاری، کتاب المغازی الخ)

حدیث مقدادؓ کا اصل نکتۂ بحث: اطناب و تکرار کا الزام قبول ہے مگر تفصیل اس لیے دی گئی کہ اکابر کی عبارات ان کے الفاظ میں سامنے آجائیں۔ان تمام عبارتوں، روایتوں میں اور بیانوں میں قوم موسیٰؑ کے نافرمان بیان کا حوالہ ہے اور وہ بھی سورۂ مائدہ کے حوالے سے مرتبین بخاری نے باقاعدہ آیت کریمہ نقل کر کے اس کے آگے سورۂ مائدہ: ۲۴ لکھ کر اس کی وضاحت کلی کر دی ہے، اس میں پوری آیت نہیں ہے تاہم دوسری احادیث میں پوری آیت کریمہ بھی ہے

جیسے بخاری کی حدیث: ۴۶۰۹ میں ہے ''فاذھب انت وربك فقاتلا انا ھاھنا قاعدون'' اس میں اضافہ ہے: ولکن امض ونحن معك ...... ۔(بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ المائدہ، باب: فاذھب انت وربك فقاتلا انا ھاھنا قاعدون (المائدہ: ۲۴)؛ امام موصوف نے اس کا باب ہی آیت کریمہ پر باندھا ہے: اس پر فتح الباری ۸ / ۳۴۵ - ۳۴۶ میں کچھ بحث ہے۔ تمام دوسرے سیرت نگاروں نے اس آیت کریمہ کا متعلقہ حصہ ضرور نقل کیا ہے اور سورۂ مائدہ کی صراحت بھی کی ہے۔ یہ بات تکلیف دہ ہے کہ متعدد اہل سیر اور محدثین کرام نے بھی آیت کریمہ کے نقل کرنے میں بسا اوقات رسم عثمانی کی پابندی نہیں کی ہے)

تمام عرب متقدمین نے اور ان کے پیرو عربی اردو سیرت نگاروں نے سورہ مائدہ کی آیت کریمہ ضرور نقل کی ہے۔ اس باب میں ایک روایتی اور درایتی مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مقداد بن عمرو بہرانی قضاعیؓ کو اس کا علم کب اور کیسے ہوا تھا؟ حضرت مقداد مہاجر تھے اور مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے پہنچے تھے اور وہ بھی غزوۂ بدر سے ذرا قبل لہذا سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان کو اس آیت کریمہ یا حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کی نافرمان قوم کا سلوک کیونکر معلوم ہوا تھا؟ یہ سوال اس لیے ہے کہ سورۂ مائدہ کے بارے میں مفسرین اور اسباب نزول کے ماہرین کا متفقہ بیان ہے کہ وہ ۶ ہجری کے اواخر یا ۷ ہجری کے اوائل میں نازل ہونے والی سورہ کریمہ ہے۔ اور بقول مولانا مودودی وہ ایک ہی بار پوری کی پوری نازل ہوئی تھی اور وہ چند خطبات پر مشتمل ہے اور وہ سب کی سب باہم آمیز ہیں۔ ان کی تقریر شان نزول کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں:

''سورۃ کے مختلف مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ہجری کے اواخر یا ۷ ہجری کے اوائل میں نازل ہوئی ہے''۔

''بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورہ ایک ہی خطبہ پر مشتمل ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اس سورہ میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو لیکن سلسلہ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جا سکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے''۔

مولانا مرحوم نے اس کے بعد شان نزول سے مفصل بحث کی ہے اور آخر میں اس کے تین تین بڑے مضامین بتائے ہیں۔ان سے سر دست ہمیں بحث نہیں ہے (تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، مارچ ۱۹۸۴ء، ۱/ ۴۳۴ - ۴۳۶؛ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار احیاء الکتب العربیہ قاہرہ غیر مورخہ، ۲/ ۲ و مابعد: نزلت علیه المائدة كلها ...... الخ، متعدد روایات میں یہ بیان ہے کہ پوری سورۂ مائدہ سفر کے دوران ایک بار نازل ہوئی۔ یہ سفر غزوۂ خیبر کا بتایا گیا ہے۔

ان تمام روایات اور بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ سورۂ مائدہ غزوۂ بدر کے چار سال بعد نازل ہوئی، اس کی بعض آیات کریمہ اور بھی بعد میں نازل ہوئیں جیسا کہ اوپر امکان ظاہر کیا گیا اور جیسا بعض روایات ثابت بھی کرتی ہیں اور جیسا کہ آیت کریمہ ۳ 'الیوم اکملت لکم دینکم الخ کے بارے میں روایات واحادیث کا اصرار ہے کہ وہ حجۃ الوداع میں یوم عرفہ کو نازل ہوئی تھی۔(حدیث بخاری: ۴۶۰۶؛ فتح الباری ۸/ ۳۴۱؛ ابن کثیر، تفسیر، ۲/ ۱۲ - ۱۴)

بہر حال اس سورۂ کریمہ کی کسی آیت مقدسہ کے ۶ ہجری سے قبل نازل ہونے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے اور نہ روایات دی گئی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت مقداد بن عمرو/اسودؓ نے اس متاخر سورہ کی آیت کریمہ-۲۴ سے کیسے استشہاد کیا یا رسول اکرمؐ کے سامنے اس کو کیونکر پڑھا؟ اور ان کو کیسے اور کیونکر معلوم ہوا کہ موسیٰ کی قوم نے شہر مقدس پر جہاد کرنے اور اس میں داخل ہونے کے حکم الٰہی کے جواب میں یہ نافرمانی کا جواب اپنے رسول مکرمؑ کو دیا تھا۔اس کا ایک واضح اور حتمی جواب یہ ہے کہ بہر حال صحابی جلیل کو سورہ مائدہ سے اس نافرمانی قوم موسیٰ کا علم نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت تک نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔اس سے زیادہ مشکل معاملہ اس آیت کریمہ کے غزوہ بدر سے قبل یا موقع پر پڑھنے کا ہے۔اس کا نزول ہی نہیں ہوا تھا تو اس کی تلاوت کیونکر کی اور اس سے استشہاد کیسے کیا تھا۔اکابر مفسرین ومحدثین اور ان کے عظیم شارحین نے اس پر کلام کیا ہے، نہ سیرت و مغازی کے اکابر اماموں اور اسلام کے محققین کرام نے۔

(ابن کثیر، تفسیر، ۲/ ۳۹ - ۴۱: کی روایات واحادیث متعلقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

متعدد صحابہ کرام نے بھی اس آیت کریمہ کا حوالہ اپنے جواب مشاورت میں دیا تھا۔ یہی سوال ان کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کو نزول آیت کریمہ سے قبل اس کا متن و معنی کیسے معلوم ہوا تھا۔ یا ان کی قوم موسی کے بارے میں معلومات کا ماخذ کیا تھا؟ روایت ابن کثیر میں ''عام صحابہ'' کا ذکر ہے اور ان میں سے حضرت مقداد بن عمرو کندیؓ کو خاص کیا گیا ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی وغیرہ کی بحث سے یہ بہر حال واضح ہوتا ہے کہ ان عام صحابہ کرام کا تعلق انصار سے تھا کیونکہ آغاز مشاورت میں اکابر مہاجرین میں سے حضرات ابوبکر و عمر اور مقداد رضی اللہ عنہم کا مشورہ آچکا تھا اور رسول اکرمؐ انصار کے مشورہ کے منتظر تھے۔ قدیم سیرت نگاروں کے علاوہ جدید سیرت نگاروں نے بھی حضرت مقداد کو مہاجرین میں شمار کیا ہے بالخصوص اکرم ضیاء عمری نے بلاذری کی جن روایات میں دو مواقع کا ذکر کیا ہے اگرچہ ہمارے مسئلہ زیر بحث سے زیادہ متعلق نہیں ہیں تاہم وہ اس کا ایک اور اختلاف رواۃ بیان کرتا ہے۔ اس پر بحث آگے آتی ہے۔

غزوۂ بدر میں مجلس مشاورت کے مواقع: حدیث بخاری ۳۹۵۲ کے مطابق حضرت مقداد بن الاسودؓ نے رسول اکرمؐ سے یہ بات اس وقت کہی تھی جب آپؐ مشرکین پر بددعا کر رہے تھے: ''اتی النبیؐ وھو یدعو علی المشرکین ......''، امام ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے صفراء نامی مقام پہنچنے کے بعد صحابہ کرام سے مشاورت کی تھی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے مطابق اس حدیث بخاری کا وقوع اسی موقع و مقام پر ہوا۔ ابن اسحاق ابن سید الناس وغیرہ کی روایات میں وادی زفران پر مجلس مشاورت کا انعقاد بتایا گیا ہے جس کا ذکر بعض نے نہیں کیا ہے، روایات کے اختلاف کے باوجود حضرات سعدین (سعد بن معاذؓ یا سعد بن عبادہؓ) میں سے کسی ایک نے بھی یہی بات کہی تھی جب رسول اکرمؐ مدینہ منورہ سے ایک دن یا دو دن کی مسافت قطع کر کے ایک منزل پر قیام فرما چکے تھے۔ حافظ موصوف نے حضرت سعد بن عبادہ کے غزوہ بدر میں شریک نہ ہونے پر اس روایت کو صحیح قرار نہیں دیا اور ابن معاذ کو مراد لیا ہے لیکن دو مقامات پر مشورے کے امکان کی بات کہی ہے کہ رسول اکرمؐ نے دو بار مشورہ کیا: اول بار مدینہ منورہ میں جب کاروان ابی سفیان کی خبر پہنچی تھی اور دوسری بار مدینہ سے نکلنے کے بعد جیسا کہ حدیث الباب میں ہے۔ (فتح الباری، ۷/ ۳۵۹ - ۳۶۰؛ ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفی، ۲/ ۶۲ - ۶۳

ومابعد، حاشیہ نمبر ا میں ابن اسحاق کے مقام صفراء اور صحیح بخاری اور نسائی کے بیان کردہ مقام بدر کی روایات میں تطبیق دی ہے کہ اول حضرت مقداد نے یہ تقریر صفراء میں آپؐ کے جواب میں کی اور بعدازاں مختلف مقامات پر بطور استلذاذ یعنی لذت حاصل کرنے کے لیے ان جاں نثارانہ اور مخلصانہ کلمات کو بار بار دہراتے رہے''، مولانا کاندھلوی نے اصحاب رسول اللہؐ کے مدینہ سے ایک دو دن کی مسافت پر قیام کے موقع پر بھی اس جواب کا ذکر کیا ہے۔ لہذا ''استلذاذ'' کا لطیفہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس کے علاوہ دوسرے مسائل اور معاملات اس مقام سے متعلق ہیں)، نہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اور دوسرے شارحین تطبیق نے یہ وضاحت کی ہے کہ ''حدیث الباب'' میں مجلس مشاورت کا ذکر نہیں، اس میں مشرکوں پر بددعا کرنے کا بیان ہے۔ اس کی وضاحت مشاورت ومشورہ سے کرنا بہت منطقی نہیں لگتا، بلاذری نے جس روایت کو صحیح موقع قرار دیا ہے وہ البتہ کافی منطقی لگتی ہے کہ حضرت مقداد نے جنگ وقتال کی تیاری کے وقت یہ بات کہی تھی اور بخاری کی حدیث کے فقرہ رجملہ: یدعوعلی المشرکین سے ہم آہنگ بھی معلوم ہوتی ہے۔ بلاذری نے مشورہ کے وقت حضرت مقداد کی روایت کو ضعیف کیوں قرار دیا معلوم نہیں ہوسکا۔

صلح حدیبیہ کا موقع مشاورت: متعدد مفسرین ومحدثین اور بعض سیرت نگاروں نے بھی اس آیت کریمہ سے استشہاد کا ایک اور موقع مقام اور زمانہ بیان کیا ہے۔ ان میں حضرت مقداد بن الاسود تو شامل ہی ہیں بعض دوسرے صحابہ کرام بالخصوص حضرت سعد بن عبادہ خزرجی اور حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ بھی شامل ہیں اور بعض دوسروں کی شمولیت کا امکان بھی ہے، ان روایات واحادیث کا ایک مختصر تجزیہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے حدیث الباب کی شرح کے اواخر میں لکھا ہے کہ طبرانی کی روایت میں آیا ہے کہ یہ جواب حضرت سعد بن عبادہ نے حدیبیہ میں دیا تھا: ''ووقع عند الطبرانی ان سعد بن عبادة قال ذلك بالحدیبیه''حافظ موصوف نے مزید تفصیل نہیں دی مگر اپنے تبصرہ میں اس کو صواب کے قرین ترین بتایا ہے: ''وھذا اولی بالصواب''۔

حافظ ابن کثیر نے شرح آیت کریمہ کے اواخر میں امام بخاری کی ایک دوسری روایت اور امام ابن جریر کی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ نے حدیبیہ کے دن صحابہ

کرام سے اس وقت مشورہ کیا جب مشرکوں نے مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ "میں قربانی کے جانوروں کے ساتھ جاؤں گا اور ان کو بیت اللہ کے پاس قربان کروں گا"، تب حضرت مقداد بن الاسود نے عرض کیا تھا کہ ہم بنواسرائیل کے اس گروہ کی مانند نہیں ہیں جنھوں نے اپنے نبی سے کہا تھا: اذھب انت وربك فقاتلا انا ھا ھنا قاعدون ...... الخ۔ دوسرے صحابہ کرام نے یہ سن کر ان کی موافقت کی تھی۔ حافظ ابن کثیر کا تبصرہ معنی خیز ہے: یہ حدیبیہ کے دن کی اگر محفوظ روایت ہے تو اس کا احتمال ہے کہ حضرت صحابی نے غزوہ بدر کی مانند اس دن اپنے مقالہ کی تکرار کی ہو" وھذا ان کان محفوظا یوم الحدیبیة فیحتمل انه کرر ھذه المقالة یومئذ کما قاله یوم بدر "۔ حافظ ابن حجر کے تبصرہ سے اس کا موازنہ بھی خاصا دل چسپ ہے۔ ان میں سے اول الذکر مقام حدیبیہ کو صواب کے قرین ترین بتاتے ہیں اور موخر الذکر پہلے روایت پر شبہہ کرتے ہیں اور پھر اسے تکرار قرار دیتے ہیں۔ (فتح الباری، ۷/ ۳۶۰؛ تفسیر ابن کثیر، ۲/ ۳۹؛ بالعموم سیرت نگاروں نے اور محدثین نے بھی صلح حدیبیہ کے بیان میں اس روایت طبرانی کا ذکر کیا ہے نہ اس سے استشہاد، لہذا یہ روایت قابل قبول نہیں معلوم ہوتی)

تنقیدی تجزیہ: مختلف احادیث وروایات کے مطابق رسول اکرمؐ نے غزوۂ بدر کے موقع پر کئی بار مشاورت کی۔ اولین موقع وہ تھا جب رسول اکرمؐ کو شام سے کاروان قریش کی واپسی کی خبر مدینہ میں ملی اور آپؐ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ سب نے جاں نثاری کا اظہار کیا اور حضرت مقداد بن اسودؓ نے حضرت موسیٰ کی قوم کی مانند آپؐ کو تنہا نہ چھوڑنے کا عزم جتایا اور ہر طرح سے قتال و جہاد کا اظہار کرتے ہوئے سورۂ مائدہ: ۲۴ کی تلاوت کی۔ دوسرا موقع مجلس مشاورت کا وہ تھا جب کاروان قریش کے نکل جانے کی خبر ملی اور اس کی بجائے لشکر مکہ سے مقابلہ کا قوی خطرہ درپیش ہوا۔ یہ مقام صفراء کا تھا جو مدینہ منورہ سے ایک یا دو دن کی مسافت پر جنوب میں واقع ہے۔ بعض دیگر روایات کے مطابق یہ وادی زفران کا موقع و مقام تھا، جو مدینہ منورہ سے کافی مسافت پر واقع تھی اور خاص منزل تھی۔ حضرت مقداد نے اور بعض دوسرے اصحاب کرام نے بھی قوم موسیٰ کی مانند بزدلی دکھانے کے بجائے قوی عزم اور موزوں دفاع وقتال کا

اظہار کیا اور آیت مذکورہ کا متعلقہ حصہ بھی پڑھا۔ شارحین نے ان دونوں مواقع پر تطبیق دی ہے کہ دو دو بار مشاورت کی گئی اور دونوں بار حضرت مقداد نے بالخصوص اور دوسرے اصحاب نے بالعموم عزم بالجزم کا اظہار کرتے ہوئے آیت پڑھی، اس پوری بحث میں بعض مسائل و امور ہیں جن پر بحث نہیں کی گئی ہے اور وہ تنقیدی مطالعہ کے طالب ہیں۔

مدینہ منورہ کے اندر اولین مجلس مشاورت میں قتال اور جان جانے کا اتنا خطرہ نہ تھا کہ وہ صرف ایک کاروان تجارت کو روکنے جارہے تھے اور جس کے ساتھ محافظوں کا بڑا دستہ نہ تھا لہذا ان سے مڈبھیڑ جان جوکھم کا موقع بھی نہ تھا۔ لہذا حضرت مقداد کا قوم موسی کا حوالہ اور آیت کریمہ کا حوالہ بے موقع لگتا ہے اور غیر منطقی بھی۔ بعض روایات سے اس کی تردید بھی ہوتی ہے، اس موقع اولین کی تلاش تطبیق کے ماہرین کرام نے کی ہے۔

شہر مقدس سے نکل آنے اور ایک دو دن کی مسافت کے قطع کرنے کے بعد کا موقع اس مشاورت کا اصل موقع معلوم ہوتا ہے۔ جب کاروان قریش نکل گیا تھا اور اب رسول اکرمؐ کو اور اصحاب کرام کو لشکر مکہ کا سامنا تھا، قرآن مجید کی سورہ انفال: ۵-۸ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ مدینہ/گھر سے نکلنے کے بعد ہی بعض گروہوں کو موت سامنے دکھائی دینے لگی تھی کیونکہ اب بلا کانٹے والے کاروان قریش کی جگہ کیل کانٹے سے لیس لشکر جرار سے مقابلہ درپیش تھا۔

اصحاب سیر اور ان کے امام ابن اسحاق کے مطابق یہ مقام ذفران نامی تھا۔ اس کی دوسرے اہل سیر نے بھی تائید کی ہے۔ ابن ہشام کی روایت میں بھی وادی ذفران ہی ہے بلکہ وضاحت ہے کہ رسول اکرمؐ نے صفراء کو اپنے بائیں جانب چھوڑ دیا تھا۔

ابن اسحاق کی ہی روایت کے حوالے سے ابن سید الناس وغیرہ اس مقام مشاورت کا نام وادی زفران لکھا ہے۔ جن متاخرین اہل سیر نے مقام صفراء کو مقام مشاورت قرار دیا ہے جیسے مولانا ادریس کاندھلوی وغیرہ انہوں نے روایت ابن اسحاق کو غلط نقل کیا ہے، یاقوت حموی نے ذفران کے بارے لکھا ہے: واد قرب وادی الصفراء ، اور ابن اسحاق کے مذکورہ بالا مقام کی روایت سیرت نبوی اور بدر کے غزوہ کے لیے مسیر نبوی سے نقل کی ہے۔ (معجم البلدان، دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء، ۶/۳ب)

اس کا بھی امکان ہے کہ رسول اکرمؐ نے غزوۂ بدر کے لیے میدان بدر میں خیمہ زن ہونے کے بعد پھر مشاورت کی ہو۔ حدیث الباب۔ حدیث بخاری ۳۹۵۲؛ میں واقع فقرہ / جملہ ''یدعو علی المشرکین'' اس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پوری حدیث حضرت مقداد کا دروبست بھی یہی بتاتا ہے۔ بعض دیگر روایات حدیث وسیرت میں اصحاب رسول اللہؐ کے یک زبان ہوکر اس ''مقالہ'' اور آیت کریمہ کا اظہار و تلاوت بیان بھی اسی موقع کی شہادت دیتا ہے۔

آیت کریمہ ۲۴ کے دوسرے غزوہ یعنی صلح حدیبیہ کے موقع پر پڑھے جانے کا معاملہ سرِدست بحث سے خارج ہے۔ ایک تو اس پر محدثین کا شبہہ ہے، دوسرے قائلین کا اختلاف ہے اور تیسرے سوائے ایک آدھ کے دوسرے ائمۂ حدیث نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ سیرت نگاروں نے بالعموم حدیبیہ کے عمرہ کے دوران رسول اکرمؐ کے بیت اللہ کے پاس قربانی کرنے کے عزم کا طبرانی کا جملہ لکھا ہے اور نہ ہی حضرت مقداد کے مقالہ مذکورہ بالا کا کوئی حوالہ اپنی کتب میں دیا ہے، بقول امام ابن کثیر اگر اس روایت کو بالفرض صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ نزول سورہ سے قبل حضرت مقداد کو آیت کریمہ کا علم کیسے ہوا۔ بقول حافظ ابن حجر یہ اولی بالصواب اسی صورت میں ہوگا جب صلح حدیبیہ سے قبل نزول سورہ مائدہ کو تسلیم کرلیا جائے۔

سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سورہ مائدہ ۲۴ کا متن حضرت مقداد اور دوسرے صحابہ کرام نے غزوہ بدر میں کیونکر پڑھا اور قوم موسی کا حوالہ کیسے اور کس ماخذ کی بنا پر دیا۔ یہ اہم ترین مسئلہ اور اس بحث کا نکتہ عالی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں: اول حضرت موسیؑ کی قوم کے طرز عمل کے بارے میں حضرت مقداد اور دیگر صحابہ کرام کی معلومات دوسرے سورۂ مائدہ ۲۴ کی عبارت پڑھنے کا معاملہ۔ ان دونوں کے الگ الگ جہات ہیں اور ان کا امکانی جائزہ الگ الگ پیش کیا جاتا ہے اور آغاز سورۂ مائدہ ۲۴ کے مذکورہ متن سے کیا جاتا ہے۔

یہ حتمی اور قطعی ہے کہ صحابہ کرام کو بالعموم اور حضرت مقداد کو بالخصوص سورۂ مائدہ ۲۴ سے اس کا علم نہیں ہوا تھا، مفسرین و ماہرین کا اجماعی فیصلہ ہے کہ سورہ مائدہ ۶ / ۷ ہجری سے قبل نہیں اتری تھی اور جب اتری تو کل اتری تھی، صرف ایک آیت کریمہ کا حصہ: الیوم اکملت لکم دینکم الخ بعد میں ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے یوم عرفہ کو نازل ہوا تھا۔ غزوۂ بدر تک بلکہ اس

کے چار سال بعد تک صحابہ کرام کی معلومات کا ذریعہ یہ سورہ کریمہ ہرگز نہیں تھی، لہذا اس کے تین امکانی توجیہات ہوسکتی ہیں۔

اول: صحابہ کرام اور حضرت مقداد نے بطور خاص رسول اکرم سے جو بات کہی تھی وہ اس آیت کریمہ سے ملتی جلتی عبارت میں تھی۔ وہ منزّل آیت کریمہ نہیں تھی۔

دوم: قوم موسی کے طرز عمل کے برعکس مومنانہ جواب دیتے وقت بطور تمثل آیت کریمہ کا یہ حصہ بیان کیا ہو لیکن اس کا امکان کم ہے۔ ویسے صحابہ کرام اور بنفس نفیس رسول اکرمؐ کسی معاملہ اور مسئلہ میں اسی مفہوم کی آیت کریمہ پڑھ دیا کرتے تھے جس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہی واقعہ یا معاملہ اس آیت کریمہ کی شان نزول تھی۔ اسباب النزول کی روایات میں اور بعض دوسرے ابواب میں بھی ایسے امتثال کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مگر ایسی آیات سے امتثال ہمیشہ نزول کے بعد واقعات کے ضمن میں ہوتا تھا، نزول آیات سے قبل ان سے امتثال کا معاملہ ممکن ہی نہیں۔

سوم: حضرت مقداد اور دیگر صحابہ کرام کو اس واقعہ کا علم تورات کے عربی نسخوں سے ہوا تھا۔ اس میں قوم موسی کے طرز عمل سے متعلق آیت تورات اسی عبارت کی رہی ہو۔ اس کا امکان زیادہ قوی ہے کیونکہ قرآن مجید کے اپنے عمومی بیانات کے مطابق وہ سابقہ صحف بالخصوص تورات کی تصدیق و تائید کرتا ہے اور خاص واقعہ یہ ہے کہ بعض آیات کریمہ تورات و انجیل و زبور اور دیگر صحف سماویہ میں مشترک تھیں جیسا کہ حضرت سلیمانؑ کے ملکۂ سبا کے نام نامہ گرامی میں ''بسم اللّٰه الرحمن الرحیم (بسمله)'' کے ثبت کیے جانے کا واقعہ ہے، ان کے علاوہ بھی متعدد دوسری آیات کریمہ زبان و بیان/عبارت میں مشترک ہوسکتی تھیں اور واقعتاً تھیں بھی۔ یہاں یہ اعتراض نہ اٹھایا جانا چاہیے کہ صحف سابقہ عبرانی یا غیر عربی زبانوں میں تھیں لہذا ان کی عبارت مختلف تھی۔ مدینہ منورہ کے حوالے اور اس کے سماجی و دینی پس منظر میں یہ واقعہ ثابت ہے کہ کم از کم تورات کے عربی نسخے بھی تھے اور وہ یہود ہی میں نہیں مسلمان علماء میں بھی متداول تھے۔ ممکن ہے کہ سورۂ مائدہ ۲۴ کی عبارت اس میں بھی موجود رہی ہو یہی سب سے زیادہ قرین قیاس توجیہ معلوم ہوتی ہے۔

مولانا مودودی نے شرح آیت کریمہ میں اس قصے کی تفصیلات بائبل کی کتاب گنتی، استثناء

اور یشوع میں ملنے کا ذکر کر کے اس کا خلاصہ پیش کیا ہے۔مولانا عبدالماجد دریابادی نے صرف گنتی کے ابواب اوران کی آیات نقل کی ہیں۔ان میں بہت سی تفصیل ضرور ہے مگر قرآنی تعبیر والا ایک بھی جملہ نہیں ہے۔ بلکہ خاص اس آیت کریمہ کے باب میں کم از کم دریابادی نے کوئی آیت تورات یا باب و کتاب کا حوالہ ہی نہیں دیا ہے۔لہذا ابھی تک یہ تحقیق طلب معاملہ ہے۔عربی تورات فی الوقت دستیاب نہیں ، اردو ، انگریزی کی عبارتوں سے پتہ چلانا دشوار ہے ۔ (تفہیم القرآن، ۱/ ۴۶۰ - ۴۶۱ ؛تفسیر قرآن (تفسیر ماجدی) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۹۵ء، ۱/ ۸۸۷-۸۸۹ بالخصوص حاشیہ نمبر ۱۰۰)

استفسار و استصواب نبوی کے جواب میں حضرت مقداد اور دیگر صحابہ کرام کے بیان میں سورہ مائدہ ۲۴ کے درآنے کی ایک اور توجیہ بھی کی جاسکتی ہے مگر وہ روایت حدیث کے معاملے میں بعض نئے مسائل کھڑے کر دیتی ہے۔ یہ چوتھی توجیہ یہ کہ حضرت مقداد وغیرہ صحابہ کرام نے اپنے جواب میں قوم موسیٰ کے طرز عمل کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہو مگر غزوہ بدر کے چار سال بعد سورہ مائدہ ۲۴ کے نزول کے بعد اپنی بات میں اس آیت کریمہ کو شامل کر دیا ہو اور پھر جب کبھی اس واقعہ بدر اور اس کی مشاورت کی روایت انہوں نے کی ہو تو اس میں آیت کریمہ شامل کر دی ہو،صحابہ کے علاوہ بعد کے راویوں کے اس آیت کریمہ کے متن حدیث میں شامل کرنے کا قطعی امکان نہیں ہے۔ یہ قطعی ہے۔حضرت مقداد اسے شامل کر سکتے تھے اوران کے شامل کردہ متن کو ہی ان سے حضرت ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے حدیث بخاری کے مطابق اخذ کیا تھا اور حضرت ابن مسعود سے ان کے پیڑھی در پیڑھی دوسرے رواۃ نے۔

اس توجیہ چہارم کا امکان تو بہرحال ہے اور وہ خاصی جاندار اور قابل یقین بھی لگتی ہے مگر اس کے خلاف شواہد بھی ہیں۔تمام محدثین واہل سیر متفق ہیں کہ حضرت مقداد اور بعض دوسرے صحابہ کرام نے یہی عبارت آیت غزوہ بدر کے موقع پر مشاورت میں پڑھی تھی۔شارحین میں سے کسی نے بھی یہ امکان نہیں جتایا ہے کہ اس جواب میں امتثال کا بھی کوئی پہلو تھا۔حضرت مقداد اور دوسرے صحابہ کرام کا جواب قطعی تھا اور اسی عبارت آیت کے ساتھ تھا۔حضرت مقداد کے جواب کے بعد بعض انصاری صحابہ کرام کو خیال ہوا تھا کہ کاش ایسی ہی قطعیت کے ساتھ اور اسی عبارت میں

ان کی طرف سے بھی جواب پیش کیا جائے اور پھران کے نمائندہ صحابہ کرام یا مشیران عظام نے اسی کا تابع کیا تو وہ مطمئن ہوگئے تھے اور رسول اکرمؐ فرط مسرت اور فرط افتخار سے جھوم اٹھے تھے کہ آپؐ کی امت اسلامی قوم موسیٰ کی مانند نہیں تھی۔ اگر اس چوتھی توجیہ کو تسلیم کرلیا جائے تو صحابہ کرام کی روایت حدیث پر حرف آتا ہے کہ وہ بعد کی باتیں اپنے پہلے بیانات میں شامل کردیتے تھے۔ یہ پہلو روایت ودرایت حدیث دونوں کے لحاظ سے اہم ہے مگر اس میں خطرات زیادہ ہیں۔

قوم موسیٰؑ کے طرز عمل کے بارے میں حضرت مقداد اور دوسرے صحابہ کرام کی معلومات کا ماخذ یہودی علماء سے ربط وضبط تھا۔ مکہ مکرمہ کے قیام نبوی کے زمانے میں دشمنان دین وعقل نے رسول اکرمؐ کو زچ کرنے اور اعتراض کرنے کی خاطر اپنے خاص سفیروں اور علماء کے ذریعہ ان ہی یہودی علماء سے ایسے اعتراضات درآمد کرنے کی عالمی پالیسی اپنائی تھی پھر مکہ ومدینہ کے قدیم اور مسلسل روابط نے عربوں کو بالعموم اور مکہ مکرمہ کے باسیوں کو بالخصوص بہت کچھ آگاہی بخشی تھی۔ حضرات صحابہ کرام بالخصوص انصار تو ان کے ہی درمیان مدتوں سے رہتے بستے آئے تھے لہذا وہ ان کے دین ومعاشرہ سے خوب واقف تھے اور ان کی روایات اور تورات کی تعلیمات سے بھی کافی آگاہ ہوچکے تھے خاص کر ان کے علماء کا طبقہ حضرت مقداد اور دوسرے مہاجرین نے غزوہ بدر کے قبل لگ بھگ دو سال کا عرصہ ان یہودیوں کے درمیان گزارا تھا۔ لہذا ان کی معلومات کا سب سے معتبر ذریعہ یہی تھا۔ پھر حضرت عبداللہ بن سلام قینقاعی جیسے حبر الیہود وعالم نے روز ہجرت ہی اسلام قبول کرلیا تھا اور ان جیسے علماء یہود سے صحابہ کرام کو تورات کی تعلیمات اور حضرت موسیٰؑ کی آسمانی وتاریخی تعلیمات اور ان کی قوم کے طبقات وافراد کی تاریخ وطرز عمل کا ماخذ ومرجع بننا قدرتی تھا۔

ان تمام مباحث وجہات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مقداد اور دیگر صحابہ کرام کے جواب میں سورہ مائدہ کی عبارت کا درآنا اور قوم موسیٰ کے طرز عمل کا حوالہ دینا بنیادی طور سے یہودی تعلیمات اور تورات کی آیات کریمہ سے واقفیت کا نتیجہ تھا۔ جواب صحابہ کرام میں سورہ مائدہ ۲۴ کی عبارت کا من وعن شامل ہونا اب بھی قابل بحث ہے تاہم یہ توجیہ دل کو لگتی ہے کہ آیت قرآنی کے مماثل آیت تورات کی عربی عبارت رہی تھی اور اسی کو صحابہ کرام نے نقل کردیا ہو جو سورۂ مائدہ

۲۴ کی آیت کریمہ بھی تھی اور بعد کے راویوں نے یا خود راوی صحابہ کرام نے اسے قرآنی آیت کے بطور نقل کیا ہو، یہ سارا تجزیہ اس صورت میں قابل قبول ہے جب حضرت مقداد کے مقالہ کی روایات بخاری واحمد وابن اسحاق کو قبول کرلیا جائے اور بظاہر ان عظیم محدثین وائمہ سیرت کی شہادتوں اور روایتوں کے بعد ان کو قبول کرنا آسان اور مسترد کرنا دشوار ہے۔

حدیث وسیرت کے دوقدیم ترین ماخذ کا معاملہ مذکورہ بالا اکابر وامہات کتب سے قطعی مختلف نظر آتا ہے۔تاریخ وسیرت کے امام ابن سعد نے حضرت مقداد بن عمرو البہرانی کے مشورہ و مقالہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے عرض کیا تھا: والذی بعثك بالحق لو سرت بنـا الی برك الغماد لسرنا معك حتی ننتهی الیه ۔یہ کل مشورہ حضرت مقداد ہے، اس میں قوم موسی کے طرز عمل کا ذکر ہے اور نہ سورہ مائدہ ۲۴ کا حوالہ۔ یہ خاصا اہم معاملہ ہے۔ (ابن سعد، الطبقات الکبری، دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء، ۲/ ۱۴؛ نیز ۳/ ۱۶۲: میں بہر حال بخاری کی مماثل روایت موجود ہے جس میں قوم موسی اوران کے مقالہ/آیت کریمہ کا ذکر ہے)

اسی طرح کتب حدیث میں مسلم میں حضرت مقداد کے اس مقالہ اور قوم موسی کے حوالہ اور سورہ مائدہ کا ذکر نہیں ہے، حافظ ابن کثیر نے امام بخاری کی روایت نقل کرکے خاص طور سے وضاحت کی ہے کہ امام بخاری اس باب میں منفرد ہیں اور مسلم ان کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔

بعض متاخر محدثین واہل سیر نے بھی حضرت مقداد کے اس مقالہ اور سورہ مائدہ کے حوالہ سے گریز کیا ہے۔ان میں امام ابن حزم (علی بن احمد م ۴۵۶) شامل ہیں جو مشورہ عام کا بہت مختصر ذکر اپنی کتاب سیرت میں دیتے ہیں (جوامع السیرۃ، دارالمعارف مصر غیر مورخہ ۱۰۹۔ اس سے قبل ذفران میں نزول کا ذکر بھی ہے اور حضرت سعد بن معاذ کے مشورہ کا بھی ہے جس میں انہوں نے عرض کیا تھا کہ اگر آپ ہم سے اس سمندر میں کود پڑنے کا حکم دیں گے تو ہم کود پڑیں گے لہذا یا رسول اللہ برکت الٰہی کے ساتھ روانگی فرمایئے۔لو استعرضت هذا البحر بنا لخضناه معك الخ۔

ہندوستان کے مسلم حکمراں
اور حرمین شریفین کی علمی وثقافتی خدمات

پروفیسر یسری احمد زیدان
مترجم صاحب عالم اعظمی ندوی

اسلامی فتوحات کے دائرے میں آتے ہی ہندوستان کے روابط حرمین شریفین سے استوار ہوگئے تھے، وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید گہرائی آتی گئی، جیسے دہلی سلطنت ۶۴۸ - ۹۲۳ھ / ۱۲۴۹ - ۱۵۱۷ م (۱) قیام کے بعد اس میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کی بڑی وجہ سلاطین دہلی کے دل میں حرمین شریفین کی عقیدت ومحبت تھی۔ (۲)

چونکہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے مذہبی اور دینی تعلق کے ساتھ ایک خاص علمی اور ثقافتی تعلق بھی رہا ہے، جو سلاطین دہلی اور آزاد مسلم ریاستوں کے زمانہ میں بام عروج تک پہنچ گیا (۳)، ہندوستان کی یہ علمی اور ثقافتی تاثیر حرمین شریفین تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دوسرے اسلامی ملکوں اور شہروں جیسے مصر (۴) اور شام (۵) اور دیگر اسلامی اور عربی مما لک تک بھی پہنچی۔

لیکن حرمین شریفین کے دینی مرتبہ اور خانہ خدا کی بستی اور شہر نبوی ہونے کی وجہ سے ہندوستانیوں کی ثقافتی تاثیر یہاں زیادہ واضح انداز میں ظاہر ہوئی، ہندوستانی علماء کی ایک بڑی تعداد حجاز کی طرف کھنچی چلی آئی، جنہوں نے مستقل طور پر یہاں سکونت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ

پروفیسر شعبہ تاریخ وتمدن اسلامی، دارالعلوم کالج، جامعہ قاہرہ۔

ریسرچ اسکالر شعبہ تاریخ وتمدن اسلامی، دارالعلوم کالج، جامعہ قاہرہ۔

یہاں کی علمی اور ثقافتی زندگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہاں کی تعلیمی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کیا، ان علماء میں سے کچھ قاضی ہوئے اور کچھ نے امامت کے فرائض انجام دیے اور ایک اچھی خاصی تعداد علوم نقلیہ اور عقلیہ نیز قراءات کے درس و تدریس میں مصروف رہی، ان میں سے بعض نے کتابت اور نقل نویسی اور دوسری ادارتی خدمات بھی انجام دیں۔

حرمین شریفین کی علمی اور ثقافتی زندگی میں ہندوستانیوں کی مشارکت کا دار و مدار صرف علماء تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہ ہندوستان کے سلاطین اور بادشاہوں پر بھی محیط تھا، اس طور پر کہ انہوں نے مدارس اور خانقاہوں کے قیام اور ان کے لیے وقف کا انتظام، اس کے علمی میدان میں ایک اہم کرداد کے تعلق سے زیادہ تر معلومات اور تفصیلات معاصر عربی تاریخ خاص کر تذکروں کی کتابوں میں منتشر رہیں، اس تحقیقی مقالے کا اصل مقصد برصغیر کے اس علمی کردار کو اجاگر کرنا نیز تذکروں اور معاصر تاریخی کتابوں میں اس موضوع سے متعلق منتشر معلومات وتفصیلات کو یکجا کرنا ہے۔

حرمین شریفین کی علمی اور ثقافتی زندگی میں ہندوستانی بادشاہوں کی شرکت:

ہندوستان کے بادشاہوں نے حرمین شریفین کی علمی اور ثقافتی زندگی میں نمایاں حصہ لیا کیوں کہ یہ سلاطین اور بادشاہ دین دار، اہل علم، علم پرور اور ادب نواز تھے، انہوں نے علمی وثقافتی زندگی کو فروغ دینے اور اس کے لیے بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی اہمیت کو سمجھا اور عملاً اس کار خیر میں شریک ہوئے، ان بادشاہوں میں سب سے زیادہ باعلم و باعمل بنگال کے سلطان اعظم شاہ غیاث الدین بن اسکندر شاہ بن شمس الدین (ت ۸۱۴ھ/ ۱۴۱۱م) تھے، جن کو علم وفہم وخیر کے میدان میں حصہ لینے کی خوش نصیبی حاصل ہوئی (۶)، بنگال کے ہی سلطان محمد بن فندر (چندر) جن کا انتقال ۸۳۷ھ/ ۱۴۳۳م میں ہوا (۷)، اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

بنگال کی طرح گلبرگہ (۸) کے بادشاہوں کا بھی یہی حال تھا کہ وہ اپنے یہاں باسطوت علماء کو جمع کرتے، ان سے علمی مناظرہ کرتے اور ان کی شاگردی بھی اختیار کرتے، ان علماء میں علاء الدین محمد بخاری ہندی بہت مشہور ہوئے جنہوں نے اپنے زمانہ میں ہندوستان کے کئی بادشاہوں کو اپنے علمی فیض سے نوازا۔ (۹)

اس سلسلے میں ابن داؤد ہندی کا بھی تذکرہ آتا ہے کہ ان سے گلبرگہ کے بادشاہ نے علم حاصل

کیا (۱۰)، اسی طرح شہر و بندرگاہ ''کنبایہ'' (کھمبائت) کے بادشاہ نے بھی ایک ہندوستانی محدث سے حدیث نبوی کا درس لیا (۱۱)۔

علمائے ہند کی علم سے اس گہری وابستگی کی وجہ سے اس میں کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں کہ انہوں نے عالم اسلام کے سب سے مقدس و محترم مرکزوں یعنی حرمین شریفین کی طرف ہمیشہ توجہ کی، ذیل میں اس کی ایک جھلک دی جاتی ہے :

حرمین شریفین میں مدرسوں کا قیام: حرمین شریفین میں ہندوستانی مسلم بادشاہوں نے مدرسے قائم کیے جیسے مدرسۃ المنصوریۃ، مدرسۃ المجاہدیۃ، مدرسۃ الافضلیۃ (۱۲)، مدرسۃ الرسولیۃ (۱۳) وغیرہ۔ (۱۴)

الف: مکہ مکرمہ کا مدرسہ بنگالیہ غیاثیہ: اس مدرسہ کی تعمیر کا سہرا بنگال کے بادشاہ شاہ ابن اسکندر شاہ بن شمس الدین غیاث الدین ابوالمظفر کے سر جاتا ہے، جنہوں نے ۸۱۳ھ / ۱۴۱۰م میں اپنے سفیر یاقوت الغیاثی کو پیغام اور گراں قدر تحائف کے ساتھ امیر مکہ کے پاس روانہ کیا، پیغام میں امیر مکہ سے مدرسہ قائم کرنے نیز اس کے مالی انتظام اور انصرام کے لیے وقف کی جائداد خریدنے کی خواہش کا اظہار تھا، چنانچہ یاقوت الغیاثی نے امیر مکہ سے اجازت لے کر مدرسہ کے قیام کے لیے مسجد حرام سے متصل دو گھر اور مدرسہ کے وقف کے لیے امیر مکہ السید حسن بن عجلان (۱۵) سے دو باغ خریدے، جس کو امیر مکہ نے بارہ ہزار مثقال یعنی دینار پر فروخت کیا (۱۶)، یہ مدرسہ جمادی الاول ۸۱۴ھ / ۱۴۱۱م میں بن کر تیار ہوا۔ (۱۷)

مدرسہ کے تعلیمی نظام میں چاروں مذاہب کی فقہ پڑھائی جاتی تھی، مکہ مکرمہ کے چاروں قاضی یعنی مذہب شافعی کے قاضی جمال الدین محمد بن عبداللہ بن ظہیرہ، مذہب حنفی کے قاضی شہاب الدین احمد بن الضیاء الہندی (۱۸) اور مذہب مالکی کے قاضی تقی الدین محمد بن احمد الحسنی الفاسی اور حنبلی مذہب کے قاضی سراج الدین عبداللطیف بن ابی الفتح الفاسی اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ (۱۹)

مدرسہ کے اوقاف کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا، پہلے حصہ کو مدرسین کے مابین برابر تقسیم کیا گیا، تین حصے طلبہ کے طعام و قیام اور ذاتی ضروریات کے لیے مختص کیے گئے، طلبہ کی

تعداد ساٹھ تھی، ان میں سے مذہب حنفی اور شافعی پڑھنے والوں کی تعداد بیس بیس اور مذہب مالکی وحنبلی پڑھنے والوں کی تعداد دس دس تھی، پانچویں حصہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا، دو حصے مدرسہ کے منتظمین کے لیے خاص کیے گئے جن کی تعداد دس تھی اور ایک حصہ مدرسہ کی بنیادی ضرورتوں کے لیے مخصوص کیا گیا، بعد میں مدرسہ کی مزید ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک اور گھر پانچ سو مثقال میں خریدا گیا۔(۲۰)

مدرسہ کی تعمیر نو ۸۹۴ھ/ ۱۴۸۸م میں ہوئی اور اس کی عمارت کی کرسی کو مزید اونچا کیا گیا لیکن یہ خانہ کعبہ سے متجاوز نہیں تھا، امام سخاویؒ نے اپنی کتاب ''وجیز الکلام'' میں اس مدرسہ کی بہت تعریف کی ہے۔(۲۱)

جن اہم شخصیات نے اس مدرسہ میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا، ان میں (۲۲) عبدالوہاب تاج الدین بن ظہیرہ (ت ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰م) (۲۳) اور عبدالقادر بن محمد الفاسی المکی الحنبلی (۸۲۷ھ/ ۱۴۲۳م) (۲۴) اور محمد الجلال ابوالسعادات بن ظہیرہ (۲۵) ہیں، مدرسہ کے ممتاز طلبہ میں محمد بن عبدالکریم بن محمد بن عطیہ الملقب بالجمال (۲۶) اور علی بن احمد المار دینی (۲۷) سرفہرست ہیں، مدرسہ نے اپنے با استعداد علماء کی وجہ سے بڑی نیک نامی حاصل کی۔

مدینہ منورہ میں قائم مدرسہ بنگالیہ غیاثیہ: مکہ مکرمہ کے مدرسہ بنگالیہ کے بانی بادشاہ غیاث الدین ابوالمظفر نے مدینہ منورہ میں بھی ۸۱۳ھ/ ۱۴۸۰م میں ایک مدرسہ اپنے نام سے قائم کرنے کے لیے وزیر حاجی اقبال مولی خان جہانی (۲۸) کو اپنا مندوب بنا کر اہل مدینہ اور اس کے امیر کے لیے قیمتی تحائف کے ساتھ روانہ کیا، مدینہ پہنچتے ہی اس قابل وزیر نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور تکمیل کے بعد اس کے مالی انتظام کے لیے ایک وقف قائم کیا (۲۹)، مدرسہ کے لیے جو جگہ تجویز کی گئی وہ ایک بڑی حویلی تھی جسے ''الحصن العتیق عند باب السلام'' (۳۰) کے نام سے جانا جاتا تھا وزیر نے اسے خرید کر اس کا نام مدرسہ بنگالیہ رکھ دیا۔(۳۱)

مکہ مکرمہ میں قائم مدرسہ گلبرگہ: یہ مدرسہ گلبرگہ کے بادشاہ شہاب الدین ابی الغازی احمد شاہ(۳۲) کے حکم سے امیر مکہ الشریف برکات بن حسن الحسنی کے ایک گھر میں ۸۳۰ھ/ ۱۴۲۶م میں قائم ہوا جو مسجد حرام کے دروازوں میں سے ایک دروازہ باب الصفا پر واقع تھا۔(۳۳)

اس مدرسہ کا تعمیری کام ۸۳۱ھ/ ۱۴۲۷م تک جاری رہا، ابن فہد نے لکھا کہ ''اور اسی سال ہندوستانیوں نے مدرسہ گلبرگہ بنانا شروع کیا جس کی تعمیرات کا کام سال بھر تک چلتا رہا'' (۳۴)، اس مدرسہ گلبرگہ کے مالی انتظام کے لیے نے ''قعیقعان'' (۳۵) پہاڑی پر ایک گھر وقف کیا گیا، اور انتظامی امور کی ذمہ داری سلطان نے مکہ میں موجود ہندوستانیوں کی تصدیق پر شیخ علاء الدین البخاری الہندی کو سونپی، درس و تدریس کی ذمہ داری بھی شیخ اور ان کے رفیق شیخ جلال الدین عبدالواحد المرشدی نے سنبھالی، شیخ عبدالواحد کا طریق تعلیم یہ تھا کہ بلا تفریق مسلک چالیس طلبہ کو اپنی شاگردی کے لیے منتخب کرتے افتتاحی درس میں طلبہ کے علاوہ شہر کے ائمہ و فقہاء اور قضاۃ شریک ہوتے، شیخ علاء الدین نے بادشاہ کی جانب سے شیخ عبدالواحد کو خلعت اور انعام و اکرام سے نوازا نیز حاضرین کو بھی لبادے عطا کیے گئے۔ (۳۶)

جن دیگر علماء نے اس مدرسہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے، ان میں عبد الواحد ابن ابراہیم بن احمد المکی الحنفی (۸۳۸ھ/ ۱۴۳۴م) (۳۷) اور ناصر الدین المقدسی بھی ہیں، ناصر الدین المقدسی تجوید کے شعبے کے بھی نگراں تھے، ان کا انتقال ۸۴۰ھ/ ۱۴۳۶م میں ہوا۔ (۳۸)

مقامی طلبہ کے علاوہ گلبرگہ سے بھی کثرت سے طالبان علوم نبوت یہاں آتے (۳۹)، بادشاہ گلبرگہ کی کرم فرمائی جاری رہی اور وہ برابر مدرسہ اور اہل مدرسہ کے لیے ہدایا، تحائف وغیرہ کا اہتمام کرتے رہے، اساتذہ اور طلبہ دونوں کا خیال رکھا جاتا رہا۔ (۴۰)

مکہ مکرمہ میں قائم مدرسہ بنگالیہ: چند معاصر تاریخی کتابوں (۴۱) میں ایک اور مدرسہ بنگالیہ کا بھی ذکر ملتا ہے، جسے بنگال کے بادشاہ محمد بن فندر (چندر) الجلال ابوالمظفر (ت ۸۳۷ھ/ ۱۴۳۳م) نے بنوایا تھا، لیکن مزید معلومات نہیں ملتیں۔

مکہ مکرمہ میں قائم مدرسہ گلبرگہ: گلبرگہ کے سلطان شہاب الدین ابوالمغازی احمد شاہ نے وفات سے کچھ پہلے یعنی ۸۳۸ھ/ ۱۴۳۴م میں مدینہ منورہ میں یہ مدرسہ قائم کیا، اس کے لیے جو جگہ پسند کی گئی وہ عہد عباسی کے وزیر جعفر بن یحییٰ البرمکی کی حویلی تھی۔ (۴۲)

مکہ مکرمہ میں قائم مدرسہ خلجیہ (۴۳): اس مدرسہ کو محمود بن مغیث الخلجی نے مکہ مکرمہ میں

دروازہ ام ہانی کے پاس قائم کیا تھا، درس و تدریس کے لیے مذہب حنفی کے امام الشمس البخاری کو مقرر کیا گیا، ان کے علاوہ محمد بن محمد الحسنی الحنفی کا تقرر بھی عمل میں آیا (۴۴)، اس مدرسہ کے مالی انتظام و انصرام کے لیے خاصا سرمایہ فراہم کیا گیا، امام سخاوی نے اس مدرسہ خلجیہ کے معتمد مال مفتاح الحبشی الکمال بن ظہیرہ کا ذکر کیا جس کو غبن کے جرم میں ۸۸۷ھ/ ۱۴۸۲م میں سزائے موت دی گئی۔ (۴۵)

مکہ مکرمہ میں قائم مدرسہ کنبایہ: اس مدرسہ کے متعلق ابن فہد کہتے ہیں "۸۶۷ھ/ ۱۴۶۲م میں مدرسہ کنبایہ کی عمارت بن کر مکمل ہوئی (۴۶)۔

کنبایہ ہندوستان کی ایک آزاد مسلم ریاست تھی، اس کا فرماں رواں باعلم اور فاضل شخص تھا، اس نے احمد بن محمد المعروف بابن المرجانی سے ان کے مکہ سے ۸۳۸ھ/ ۱۴۳۴م میں کنبایہ تشریف لانے پر علم حدیث کا درس لیا اور ان کو انعام و اکرام سے نوازا، ابن امرجانی کنبایہ میں عرصے تک اپنے علم سے وہاں کے لوگوں کو سیراب کرتے رہے ان کا انتقال یہیں ۸۶۷ھ/ ۱۴۶۲م میں ہوا (۴۷)، علی بن محمد ابن الکریم بھی مکہ سے ۸۲۵ھ/ ۱۴۴۸م میں کنبایہ تشریف لائے۔ (۴۸)

کنبایہ کے فرماں رواؤں نے بھی دوسری ہندوستانی اسلامی ریاستوں کی طرح علم پروری کے ساتھ حرمین شریفین سے اپنا خاص تعلق رکھا اور وہاں کے علماء و فضلاء نیز طلبہ اور امراء کو مال و دولت اور گراں قدر تحائف بھیجتے رہے، بیان کیا جاتا ہے کہ ۷۸۶ھ/ ۱۳۸۴م میں کنبایہ میں خانہ کعبہ کے لیے ایک بہت ہی قیمتی دروازہ بنایا گیا اور مکہ کے امیر احمد بن عجلان کو بطور ہدیہ ارسال کیا گیا۔ (۴۹)

کنبایہ کے اسی فرماں روا نے ۸۰۹ھ/ ۱۴۰۶م میں امیر مکہ حسن بن عجلان کو قیمتی تحایف بھیجے اور ساتھ میں حرم شریف کے لیے اعلا قسم کے خیمے بھی روانہ کیے، تاکہ انہیں جمعہ کے دن مصلیوں کے سایہ کے لیے لگایا جائے، معلوم ہوا کہ مسجد حرام میں خطبہ سننے والے مصلیوں کے سایہ کے لیے اس سے پہلے کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ (۵۰)

درج بالا بیانات سے واضح ہوا کہ ریاست کنبایہ اور مکہ مکرمہ کے مابین اچھے دینی و

تجارتی تعلقات قائم تھے، مکہ کے مدرسہ ''مدرسہ کنبایہ'' کو کنبایہ کے ہی ایک مسلم سلطان نے ۸۶۷ھ/ ۱۴۶۲م میں مکہ مکرمہ میں قائم کیا تھا۔

ہندوستان کے ان مسلم فرماں رواؤں نے مکہ کے ساتھ مدینہ میں بھی مدارس قائم کیے جنہوں نے حرمین شریفین کی علمی اور ثقافتی زندگی کو فروغ دینے میں سرگرم اور فعال کردار ادا کیا اور اس کا سارا سہرا ان ہندوستانیوں کے سر ہے جنہوں نے یہ مدارس قائم کیے۔

خانقاہوں کے قیام میں ہندوستانیوں کی شرکت: سلاطین ہند کے ماتحت حرمین شریفین میں متعدد خانقاہوں کا قیام بھی عمل میں آیا، ان خانقاہوں نے اپنے مختلف ادوار میں وسیع علمی سرگرمیوں میں عملی طور پر موثر کردار ادا کیا، ان میں گراں قدر علمی کتب خانے بھی قائم کیے گئے، اکثر علماء وفضلاء نے ان خانقاہوں کے لیے اپنے کتب خانے وقف کردیے تھے، چند مشہور خانقاہیں درج ذیل ہیں:

خانقاہ رامشت (۵۱)، خانقاہ ربیع (۵۲)، خانقاہ المسدرۃ (۵۳)، خانقاہ غزی (۵۴)، خانقاہ الموفق (۵۵)، خانقاہ الخوزی (۵۶) وغیرہ، نیز ان میں باقاعدہ تعلیمی سلسلہ بھی چلتا رہا۔

مکہ کی طرح مدینہ میں بھی کئی خانقاہیں قائم کی گئیں، ان میں سب سے معروف خانقاہ ''دکالہ'' (۵۷) تھی، مکہ میں ہی قائم ایک خانقاہ کا نام ''خانقاہ ہنود'' تھا (۵۸)، اس کے علاوہ ایک اور خانقاہ جس کی نسبت سعید الہندی کی طرف کی جاتی تھی (۵۹) جو اس وقت فقہ مالکی کے سب سے پایہ کے عالم اور فقیہ سمجھے جاتے تھے، ان کے طلبہ کی ایک لمبی فہرست ہے (۶۰)، اسی طرح گلبرگہ کے سلطان احمد بن شاہ شہاب الدین ابوالمغازی نے بھی مکہ میں ایک بہت بڑی خانقاہ تعمیر کروائی تھی۔ (۶۱)

یہاں ایک بیان کا ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا، جس کا تعلق مکہ میں مقیم ہندوستانیوں سے ہے، وہ یہ کہ محمد بن اسحاق الشیر ازی جو کہ غیاث الدین الابرقوہی کے نام سے مشہور تھے، نے باب الصفا پر ایک شاندار خانقاہ ۷۷۱ھ میں قائم کی اور اسے ایران کے بادشاہ شاہ شجاع کے نام معنون کیا، اس کے انتظامی اور مالی امور کے لیے اوقاف کا نظام قائم کیا، اس خانقاہ میں لگے حجر اساسی پر درج ذیل عبارت کندہ ہے ''وقف کرنے والے نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس خانقاہ

میں ہندوستانیوں کے علاوہ بے خانماں متقی پرہیزگار غیر ملکی لوگ رہیں گے''۔(۶۲)

جن معاصر تاریخ وتذکروں کی کتابوں سے میں نے اس مقالے کے لیے استفادہ کیا ہے، ان میں ایسی کوئی چیز نہیں پائی جو اس خانقاہ میں ہندوستانیوں کے نہ رکھے جانے کی شرط کی وضاحت کرے لیکن اس کی ایک وجہ مکہ میں ہندوستانیوں کے لیے مخصوص خانقاہوں کی کثرت ہوسکتی ہے، جنہیں ہندوستانیوں نے قائم کیا تھا، جہاں تک مدینہ منورہ کا تعلق ہے تو وہاں مسجد نبوی کے جوار میں ہی ریحان احمد ایک ہندوستانی خادم نے عام فائدے کے لیے دو خوبصورت خانقاہیں قائم کی تھیں اور یہ ریحان الہندی مدینہ منورہ میں اپنے اچھے اور نیک کاموں کے لیے کافی معروف تھے۔(۶۳)

دینی علوم میں ہندوستانیوں کی شرکت: سلاطین ہند کے زمانہ میں ہندوستان کی وسیع تر علمی سرگرمیوںٴ کی سب سے بڑی دلیل جملہ علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھنے والے علمائے ہند کا حرمین شریفین میں ورود ہے، مثال کے طور پر محمود بن محمد المقری کو علوم نقلیہ اور ادب عربی میں اعلا مہارت حاصل تھی، ہندوستان میں ان علوم کو پڑھانے کے لیے ان ہی پر ہی بھروسہ کیا جاتا تھا(۶۴) اسی طرح مخدوم بن برہان الدین الہندی الاحمد آبادی بھی معانی اور بیان میں کافی شہرت رکھتے تھے، طلبہ ان سے پڑھنے کے لیے ان کے گھر پر حاضر ہوا کرتے تھے، انھوں نے اپنے گھر کو مدرسہ میں تبدیل کر دیا تھا(۶۵)، اسی طرح محمد بن التاج الحنفی علم ہیئت اور کلام میں اہم مقام رکھتے تھے(۶۶) ہندوستانی علماء میں ایک عالم راجح بن داؤد کے بارے میں امام سخاوی کا یہ قول کہ ''انھوں نے اپنے ملک میں اکابر علماء کو علوم وفنون کا درس دیا''(۶۷)، اس وقت ہندوستان میں وسیع تر علمی سرگرمیوں کے وجود پر دال ہے۔(۶۸)

اپنی اسی علمی فوقیت کی وجہ سے ہندوستانی علماء اس وقت کے اہم اسلامی ملکوں میں اعلا علمی مرتبوں پر فائز ہوئے اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے درس وتدریس میں کافی شہرت حاصل کی، حرمین شریفین کے علاوہ ان باکمال علماء کی اچھی خاصی تعداد مصر اور شام میں موجود تھی، مثال کے طور پر مصر کے مشہور علماء میں محمود الہندی(۶۹)، برہان الہندی(۷۰)، سراج الہندی(۷۱)، جلال الہندی(۷۲) وغیرہم قابل ذکر ہیں(۷۳)، علمائے ہند میں کچھ شام میں بھی اس وقت

اعلا مرتبوں پر فائز تھے، جیسے کہ عطاء اللہ الدروالی الہندی (۷۴)، بدر الہندی (۷۵)، عبد الرحمان الہندی (۷۶)، سراج الہندی (۷۷) وغیرہم۔ (۷۸)

جہاں تک حرمین شریفین کا تعلق ہے تو وہاں ہندوستانی علماء نے اہل حجاز اور دوسرے علاقوں کے لوگوں کو علمی فیوض و برکات پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ان کا فیض ان کے بعد بھی جاری رہا، ان کے شاگردوں میں کئی ہندوستانی گھرانے صدیوں تک یہاں کی علمی خدمات میں لگے رہے، ان میں بنی الضیاء کا علمی خانوادہ کافی مشہور ہوا، اس خاندان کے علماء فقہی علوم میں اچھی مہارت رکھتے تھے، اس گھرانے کا تعلق محمد بن محمد بن سعید ابن عمر بن علی الہندی الحنفی سے تھا جو ضیاء الدین (ت ۷۸۰ھ / ۱۳۷۷م) کے نام سے معروف تھے اور اس وقت کے مایہ ناز علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ سب سے پہلے مدینہ منورہ میں وارد ہوئے اور ایک عرصے تک مقیم رہ کر درس و تدریس میں لگے رہے، پھر مکہ مکرمہ میں رہائش اختیار کی اور فقہ حنفی کی تدریسی خدمات پر مامور ہوئے، ''وہ عربی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب و اصول میں باعلم شخص تھے'' (۷۹) ان کے شاگردوں میں سب سے جلیل القدر عالم عمر بن محمد ابی بکر المکی الملقب بالسراج تھے جو اپنے وقت میں حنفی مذہب کے امام سمجھے جاتے تھے اور ۷۷۳ھ / ۱۳۷۱م سے ۷۷۹ھ / ۱۳۷۷م تک مکہ میں حنفی امامت کے متولی رہے (۸۰)، انہوں نے شیخ ضیاء الدین الہندی مذکور سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، دوسرے تلمیذ رشید محمد بن داؤد المکی المعروف بالزمزمی (ت ۸۳۷ھ / ۱۴۳۳م) تھے۔ (۸۱)

شیخ ضیاء الدین الہندی کی طرح ان کے مایہ ناز فرزند شہاب الدین الضیاء، احمد بن محمد ابن سعید الہندی الحنفی تھے، جنہوں نے علمی حلقوں میں کافی شہرت حاصل کی، ان کی پوری زندگی درس و تدریس میں بسر ہوئی، انہوں نے ۸۰۷ھ / ۱۴۰۴م میں اپنی علمی لیاقت کی وجہ سے حنفی مسلک کے قضاء کی کرسی سنبھالی (۸۲) اور ابن الضیاء الہندی کے نام سے شہرت حاصل کی، ان کا انتقال ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱م میں ہوا، آپ کا شمار علم فقہ کے جید علماء میں ہوتا تھا اور آپ مدتوں درس و افتاء کی خدمت انجام دی، وہ مدرسہ بنگالیہ اور زنجبیلیہ (۸۳) اور غوانیہ (۸۴) میں فقہ کا درس دیتے تھے، اس کے علاوہ وہ فقیہ العز النویری کی بعض فقہی ضرورتوں جیسے نکاح پڑھانے کی

ذمہ داری وغیرہ کی نیابت بھی کرتے تھے، احکام اور فقہ سے متعلق اس طرح کے کچھ فرائض انہوں نے ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۰ء تک انجام دیے، پھر مستقل طور پر قضاء کی ذمہ داری سنبھالی، وہ پہلے حنفی عالم ہیں جو مکہ میں مستقل طور پر قاضی کی کرسی پر فائز ہوئے۔ (۸۵)

مکیوں میں سے جن علماء نے ابن الضیاء سے علم حاصل کیا ان میں سرفہرست القاضی الشافعی احمد بن محمد بن الجلال ابوالسعادات ہیں جو مکہ میں غیر موجود اصحاب اموال اور یتیموں کے مال و متاع کی دیکھ بھال پر مامور تھے، بعد میں انہیں حرم شریف کی نگرانی اور دوسرے دینی فرائض سونپے گئے۔ (۸۶)

ابن الضیاء کے فرزندوں میں محمد بن احمد بن محمد بن محمد بن الشہاب تھے جو اپنے والد صاحب ہی کی طرح ایک جید عالم تھے اور والد ماجد کی طرح ابن الضیاء کے نام سے معروف ہوئے، ان کا انتقال ۸۵۴ھ/ ۱۴۵۰ء میں ہوا، دینی علوم اور عربی زبان و ادب میں ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی اور ان کی مہارت کی مثال دی جاتی تھی، انہوں نے شروع میں مکہ کے منصب قضاء کی نیابت کی، پھر اس کے بعد مستقل طور پر قاضی مکہ ہو گئے، بعد میں ان کو حرم شریف کی دیکھ بھال کی ذمہ داریاں بھی سونپی گئیں (۸۷)، انہوں نے مسجد حرام کی فضیلت نیز حج و عمرہ اور فقہ و تفسیر میں متعدد کتابیں تصنیف کیں (۸۸)، ''وہ عربی زبان و ادب نیز اصول اور علم فقہ میں امام تھے، علوم و فنون و کتابت میں ید طولی رکھتے تھے، علم حاصل کرنے نیز مطالعہ سے بہت زیادہ رغبت تھی، حتی کہ مجھے السخاوی، ابوالخیر بن عبدالقوی نے بتایا کہ: میں انہیں پچاس سال سے جانتا ہوں اور میں جب بھی ان سے ملنے گیا انہیں پڑھنے اور لکھنے میں منہمک پایا'' (۸۹)، انہوں نے ساری عمر درس و تدریس و تصنیف میں بسر کی اور ان سے کئی اماموں اور قاضیوں نے علم حاصل کیا۔ (۹۰)

ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی محمد الرضی ابوحامد بن الضیاء الحنفی (۸۵۸ھ/ ۱۴۵۴ء) نے بھی کافی علمی شہرت حاصل کی، انہوں نے بھی والد ماجد سے فقہ و نحو و صرف اور دوسرے علوم حاصل کیے اور پھر اصول اور معانی بیان کے درس و تدریس میں مشغول ہوئے، علمی کاوشوں کے ساتھ ساتھ پہلے اپنے والد صاحب پھر اپنے بڑے بھائی صاحب کی امور قضاء میں نیابت کی، ان کے بعد مستقل طور پر یہ خدمات انجام دیں، درس افتاء کے ساتھ ساتھ فقہ میں تالیف کا کام

بھی کیا، ان سے علم حاصل کرنے والوں میں المحیوی المالکی بھی ہیں۔ (۹۱)

اس خاندان (۹۲) کے علاوہ اور بھی کئی ہندوستانی علمی خاندان نیز جید علماء تھے جنہوں نے حرمین شریفین میں علوم دینیہ کے درس و تدریس میں نمایاں کردار ادا کیا، جن سے اہل حجاز اور دوسرے لوگوں نے مختلف علوم وفنون میں استفادہ کیا۔ (۹۳)

ہندوستانی علماء جنہوں نے مکہ میں اصول فقہ میں مہارت حاصل کی: ان میں سرفہرست العزابوبکر بن عطاء اللہ الہندی ہیں جن سے مکہ کے فقیہ محمد بن ابراہیم الحنفی نے علم حاصل کیا (۹۴)، اسی طرح حجاز کے عالم وصدر ابراہیم بن علی الملقب بابن ظہیرہ نے اصول فقہ کی تعلیم ایک ہندوستانی عالم سے حاصل کی۔ (۹۵)

ان ہندوستانی علماء میں حسین بن احمد بن ناصر الحنفی بھی تھے، جو مسجد حرام میں تدریسی خدمات پر مامور تھے لیکن مسجد حرام کے مقابل مدرسہ عزالدین عثمان الزنجبیلی میں بھی درس دیا کرتے تھے نیز اس کے وقف کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد تھی، تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ مکہ کے قاضی جمال الدین بن ظہیرہ کے بعض اہم فیصلوں اور فتوی نویسی کی نیابت بھی کرتے تھے اور اپنے مسلک کے فقہی مسائل پر بحث ومباحثہ بھی کرتے تھے۔ (۹۶)

ایک اور عالم ابوعلی محمود بن علی الہندی ہیں جو ''الہندی'' کے نام سے مشہور تھے، ان کو قرأت اور روایت میں امامت کا درجہ حاصل تھا (۹۷)، ان کے معاصر عالم محبّ محمد بن محمد الہندی الحنفی (۷۸۹ھ/ ۱۳۸۷ء) بھی تھے جو مسلک شافعی کے خلاف مذہب حنفی میں بہت متعصب تھے۔ (۹۸)

بچوں کی تعلیم وتربیت میں مکی بن سلیمان الہندی ۸۳۹ھ/ ۱۴۳۵ء نے شہرت حاصل کی (۹۹)، انہوں نے برسوں بچوں کی معلّمی کا کام انجام دیا، حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ شاطبیہ اور قراءات کے بھی حافظ باکمال تھے، انتقال ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۲ء میں ہوا۔ (۱۰۰)

جہاں تک مدینہ میں ہندوستانی علماء کی علمی کارکردگی کا تعلق ہے تو یہاں یہ ذکر کردینا کافی ہوگا کہ علامہ ضیاء الدین الہندی الحنفی نے مکہ مکرمہ سے پہلے مدینہ کو افادے اور استفادے کا مرکز بنایا تھا اور وہاں کئی سال تک درس وتدریس اور فتاوی میں مشغول رہے (۱۰۱)، اسی طرح بہاء الدین الہندی الحنفی نے بھی مدینہ منورہ کی علمی زندگی میں اہم کارنامے انجام دیے، ان کا شمار اصول

اور فقہ کے اہم اساتذہ میں ہوتا تھا، ان کا معمول تھا کہ دن کا اکثر و بیشتر حصہ مسجد نبوی میں ہی درس و تدریس میں گزارتے تھے، طلبہ میں بہت مقبول اور محبوب تھے، کیوں کہ انہیں علم سکھانے میں وہ کسی قسم کا تساہل نہیں برتتے تھے حتی کہ اگر کسی مشغولیت کی وجہ سے مسجد تشریف نہیں لا پاتے تھے تو طلبہ کو مکمل اجازت ہوتی تھی کہ وہ ان کے گھر جائیں اور علمی پیاس بجھائیں۔ بعض طلبہ نے تو ابن حاجب کی پوری کافیہ ان کے گھر میں ہی پڑھی، اپنے زمانہ میں وہ عربی زبان و ادب، اصول و فقہ وغیرہ کے مسلم امام سمجھے جاتے تھے وہ بےحد ذہین، عقل مند و بردبار و بااخلاق انسان تھے۔ (۱۰۲)

ایک اور ہندوستانی عالم راجح بن داؤد الاحمد آبادی الحنفی تھے جو علمی اور اخلاقی اوصاف میں مسجد نبوی شریف کے ممتاز علماء میں شمار کیے جاتے تھے (۱۰۳)۔

مذکورہ بالا مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی علماء کی اچھی خاصی تعداد نے حرمین شریفین میں دینی علوم کے درس و تدریس میں اہم کردار ادا کیا، نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان علماء نے فقہ حنفی کے درس و تدریس پر زیادہ توجہ دی اور اہل مکہ اور مدینہ نے ان ہندوستانی علماء سے علمی استفادہ بھی خوب کیا جس سے ہندوستانی علماء کی علمی حکمرانی پورے حجاز میں کئی صدیوں تک قائم رہی اور اکثر علماء بڑے علمی مناصب پر بھی فائز رہے، جو مناصب حرمین شریفین میں ان کے دینی و علمی اخلاص کی وجہ سے ان کے لیے مخصوص رہے، ان میں سرفہرست منصب قضاء ہے جو کئی ہندوستانی خاندانوں میں نسل در نسل باقی رہا، ان خاندانوں میں سب سے مشہور خاندان ''بنی الضیاء'' تھا جس خاندان کا لقب ہی ''قضاۃ مکہ'' تھا۔ (۱۰۴)

ان کے علاوہ اور بھی کئی شخصیات اس منصب پر فائز رہیں جن میں شاذی الہندی کا نام بھی آتا ہے جو مکہ میں مذہب حنبلی کے قاضی ہوئے (۱۰۵) متعدد ہندوستانی علماء قاضیوں کے شرعی امور کو انجام دینے میں ان کی نیابت بھی کرتے تھے (۱۰۶)، اسی طرح کچھ حرم مکی میں نیابت امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے (۱۰۷) بلکہ بعض تو مذہب حنفی کے مطابق امامت کے منصب پر فائز تھے، ان میں سے محمد بن محمد الہندی الکابلی الحنفی کا نام سرفہرست ہے، وہ متورع اور مقدس انسان تھے، انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اور سب کو وقف کر دیا (۱۰۸)، ان ہی میں احمد بن سعد بھی ہیں، جو امیر مکہ السید برکات اور پھر ان کے بیٹے کی نیابت بھی کرتے رہے۔ (۱۰۹)

عربی زبان وادب میں ہندوستانیوں کی شرکت: یقیناً ہندوستانی علماء عجم نژاد تھے لیکن کثیر تعداد میں ان میں ایسے باکمال پیدا ہوئے جنہوں نے علم لغہ اور بلاغت میں بہت نام کمایا، بلکہ کئی تو ایسے ہوئے کہ ان کی فصاحت اور بلاغت کی وجہ سے عربی نژاد ہونے کا گمان ہوتا تھا، ان میں سرفہرست عبدالرحمان بن علی الہندی ہیں، فصاحت اور بلاغت میں ان کی مثال دی جاتی تھی (۱۱۰)، ایک بار حرم مکی کے قاری العفیف الدلاصی نے عجمیوں کے قرأت پڑھنے پر ممانعت کی کیوں کہ ان کی اپنی رائے کے مطابق یہ لوگ مخرج کو صحیح طریقے سے ادا نہیں کرتے تھے، ممانعت کی خبر سن کر ان کے پاس کئی ہندوستانی علماء حاضر ہوئے اور ان کے سامنے اس طرح قرأت کی کہ انہیں ایک بار بھی ٹوکنے کا موقع نہیں ملا۔ (۱۱۱)

ادب عربی میں سب سے ممتاز عالم احمد بن محمد الشہاب بن الکمال الہندی الحنفی (۸۲۷ھ / ۱۴۲۴م) تھے جو علوم نقلیہ کے ساتھ علوم عقلیہ میں بھی ماہر تھے (۱۱۲) ایک اور عالم برہان الدین الہندی ہیں جو عربی زبان و معانی میں پائے کے استاذ سمجھے جاتے تھے، حتی کہ حجاز کے رئیس اور اس وقت کے سب سے ممتاز عالم ابراہیم بن علی المکی الملقب با بن ظہیرہ (ت ۸۹۱ھ / ۱۴۸۶م) جو دین وفضل وعقل وشہامت میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے، انہوں نے بھی شیخ برہان الدین الہندی سے عربی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی (۱۱۳)، ایک اور ابراہیم الہندی الحنفی ہیں جن سے البرہان بن ظہیرہ نے عربی زبان ومعانی و بیان کی تعلیم حاصل کی (۱۱۴)، ان کے علاوہ الضیاء الہندی والبہاء الہندی جن کی علمی خدمات کا تذکرہ گزر چکا ہے، یہ سب عربی زبان وادب کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔

نقل نویسی میں ہندوستانیوں کی شرکت: مکہ مکرمہ میں موجود ہندوستانیوں میں دو لوگوں کا تذکرہ معاصر تاریخی کتابوں میں خاص طور پر آیا ہے جنہوں نے نقل نویسی میں بہت اہم کردار ادا کیا، ان میں سے پہلے صاحب کا نام محمد بن محمد بن محمود الہندی ہے، یہ شیخ عبداللہ الیافعی کے خدمت گاروں میں تھے اور ان کی تصنیفات لکھا کرتے تھے، اسی طرح وہ قاضی ابوالفضل النویری کی خدمت میں بھی رہے اور ان کی علمی مجلسوں اور حلقہ درس میں شریک ہوتے رہے اور ان سے علمی استفادہ کیا۔ (۱۱۵) ایک اور نام نجیب الدین الہندی کا ہے انہوں نے کثرت سے کتابوں کی نقل نویسی کا

کارنامہ انجام دیا (۱۱۶)، ان کا انتقال مکہ میں ۹۰۷ھ کے شروع میں ہوا، ایک اور صاحب محمد بن عمر الہندی کا نام ہے، ان کے بارے میں بھی کہا گیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے بہت ساری کتابوں کی نقل نویسی کی۔ (۱۱۷)

ہندوستانی علماء کا یہ ذکر بہت دلچسپ ہے اور اس لحاظ سے قابل رشک ہے کہ انہوں نے اس وقت سلطنت ہند کے ماتحت حرمین شریفین کی علمی اور ثقافتی زندگی میں بہت ہی موثر اور فعال کردار ادا کیا، ان علماء کے علاوہ ہندوستانی علماء کا ایک دوسرا طبقہ بھی ہے جس نے حرمین شریفین کے ممتاز علماء سے علوم عقلیہ ونقلیہ کا اکتساب کیا، وہاں کی علمی اور ثقافتی زندگی میں ان کے براہ راست اور فعال کردار سے تاریخ کے صفحات خاموش ہیں مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہاں کی علمی زندگی کا وہ خاص جزء ضرور رہے۔ (۱۱۸)

مجموعی طور پر حرمین شریفین کی علمی اور ثقافتی زندگی میں ہندوستانی علماء کا وجود برقرار رہا، مدرسے کی تعمیر وترقی کا معاملہ ہو یا پھر نقل نویسی کا یا پھر کتابوں کی خرید وفروخت کا مسئلہ ہو، معاصر تاریخی کتابوں کے بیانات اندازہ ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کے دینی وعلمی ماحول میں ہمارے ہندوستانی علماء نیک نام رہے۔ (۱۱۹)

ہندوستانی علماء کی ان علمی سرگرمیوں اور ثقافتی تعلقات سے ہندوستان شناسی کی دلچسپی میں اضافہ ہوا، دونوں ملکوں کے مابین علماء کی آمد ورفت نیز ان کے احوال کی خبروں کا بھی تبادلہ ہوا (۱۲۰) یہی نہیں ہندوستان جانے والے حجازی تاجروں کے حالات وغیرہ سے واقفیت کا رجحان بھی سامنے آیا۔ (۱۲۱)

ہندوستان اور حرمین شریفین کے مابین ارتباط وتعلقات مضبوط کرنے میں جہاں ان عوامل نے اہم کردار ادا کیا، وہیں کعبہ شریف کی قلمی تصویر کشی اور ہندوستانیوں کو ان سے متعارف کرانے کی مثالیں بھی سامنے آئیں (۱۲۲) جس سے مکہ مکرمہ کے لیے مخصوص جذباتی اور دینی تعلقات گہرے ہوتے گئے۔

قابل ملحوظ پہلو یہ ہے کہ تقریباً سارے ہندوستانی علماء حنفی مذہب پر قائم رہے بلکہ بعض میں مذہبی تعصب بھی سرایت کر گیا (۱۲۳) حتی کہ بعض متشدد علماء دوسرے مسلکوں خاص طور پر مذہب

شافعی کی مذمت سے بھی نہیں گریز کرتے تھے یہ عمل یقیناً محمود ہے تاہم اس کو مخصوص مناظرانہ ماحول کے تناظر میں ہی دیکھنا چاہیے۔

اسی طرح یہ بھی واضح ہوگیا کہ ہندوستانی علماء کا کردار مکہ مکرمہ میں مدینہ منورہ کے مقابلہ میں زیادہ اہم رہا، اس کی سب سے بڑی وجہ مکہ مکرمہ کا حج وعمرہ کے شعائر نیز بیت عتیق سے ہم سائیگی کی برکت ہے، چوں کہ ہندوستانی علماء کی تعداد مدینہ کے مقابلہ میں مکہ میں زیادہ رہی لہٰذا مکہ میں ان کا علمی کردار بھی زیادہ واضح صورت میں ظاہر ہونا فطری بات ہے۔

خلاصہ: سلطنت ہند کے زمانہ میں سلاطین دہلی کے سیاسی نمائندوں اور ہندوستانی علماء کا حرمین شریفین میں بہت اہم کردار رہا، سب سے اہم دور متعدد مدارس کا قیام ہے جن کی تعداد سات تھی پانچ مکہ میں اور دو مدینہ میں، اسی طرح متعدد خانقاہیں بھی قائم کی گئیں جو تزکیہ نفس و تدریسی کاموں کے علاوہ کتب خانوں کا کام بھی دیتی تھیں، نیز طلبہ اور مدرسین ان خانقاہوں میں رہائش بھی اختیار کرتے تھے۔

ہندوستانی علماء نے علوم عقلیہ اور نقلیہ دونوں میں کافی مہارت پیدا کی اور وہاں کی تعلیمی زندگی پر خاص طور سے اثر انداز ہوئے اور حرمین شریفین نیز مدارس وخانقاہوں میں ان کی تعلیمی و تدریسی کارکردگی کے دائرے میں سارے علوم وفنون آتے ہیں۔

علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے نتیجہ میں ہندوستانی علماء اعلا علمی اور دینی مناصب پر فائز رہے، جس میں قضاء اور حرم شریف کی امامت بھی ہے، معاصر تاریخی تذکروں سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ مدینہ منورہ کے مقابلہ میں مکہ میں ان ہندوستانی علماء کی علمی اور ثقافتی کارکردگی زیادہ واضح رہی لیکن مجموعی طور پر ان ہندوستانی علماء نے دینی، علمی اور ادبی صلاحیت نیز محنت وریاضت اور اعلا تصنیفی ذوق سے حرمین شریفین کے علمی معیار کو بلند و بالا کیا اور عالم اسلام میں اس کی عظمت و وقار میں چار چاند لگائے، حرمین شریفین میں اس اہم ہندوستانی عنصر کی کارکردگی صرف علمی اور ثقافتی پہلوؤں پر منحصر نہیں رہی بلکہ دوسرے میدانوں پر بھی محیط رہی (۱۲۴)۔

حواشی

(۱) اس مقالے کے تاریخی واقعات سلطنت مغلیہ سے پہلے کی مسلم حکومتوں پر محیط ہیں، ان میں وہ آزاد اسلامی

ریاستیں بھی شامل ہیں جو سلطنت مغلیہ سے پہلے مختلف زمانوں میں قائم ہوئیں، جن مختلف اسلامی خاندانوں نے دہلی پر حکومت کی ان میں غوری خاندان (۶۰۳-۶۸۹ھ/ ۱۲۰۶- ۱۲۹۰م)، خلجی خاندان (۶۸۹- ۷۲۰ھ/ ۱۲۹۰- ۱۳۲۰م)، آل تغلق (۷۲۰-۷۹۹ھ/ ۱۳۲۰- ۱۳۹۶م) اور آخر میں مغلیہ خاندان ہیں ان حکومتوں کی معاصر کئی آزاد اسلامی ریاستوں میں بنگال، گجرات اور دکن کی آزاد ریاستیں ہیں (جن کا سلطنت مغلیہ سے مکمل الحاق مغلیہ خاندان کی تاسیس نیز ایک مکمل مربوط حکومت قائم ہونے کے بعد ہوسکا، خاص طور پر بادشاہ اکبر کے زمانہ میں جس نے ہندوستان کو ایک مرکزی حکومت کے تابع متحد کرنے کی کوشش میں ساری اسلامی اور غیر اسلامی ریاستوں سے جنگیں کی اور ایک مرکز کے تحت جمع کیا، اس کے اس عمل کو اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اپنے اپنے دور میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ مترجم)، ان آزاد اسلامی ریاستوں نے حرمین شریفین سے اپنے دینی اور ثقافتی تعلقات خاص طور سے استوار کیے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان اسلامی ریاستوں نے حرمین شریفین سے ہندوستان کے تعلقات مضبوط کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا، بنگال کے بادشاہوں کی سیرت کے لیے دیکھیں الفاسی: العقد الثمین، ج ۴، ص ۱۰۴-۱-۸/ الصیر فی: نزہۃ النفوس والابدان، ج ۳، ص ۲۹۷- ۳۶۳/ ابن حجر: انباء الغمر، ج ۲، ص ۴۹۶/ السخاوی: وجیز الکلام، ج ۲، ص ۵۳۴- ۵۴۳ اور الضوء اللامع: ج ۲، ص ۱۶۶- ۳۱۳/ ج ۸، ص ۲۸۰- ۲۹۳/ ج ۱۰، ص ۲۱۴/ التحفۃ اللطیفۃ، ج ۱، ص ۱۹۲/ السمہودی: وفاء الوفاء، ج ۱، ص ۲۰۷/ گجرات کے بادشاہوں کی سیرت کے لیے دیکھیں السخاوی: الضوء اللامع: ج ۲، ۹۱/ ج ۱۰، ص ۱۴۴/ گلبرگہ کے بادشاہوں کی سیرت کے لیے دیکھیں، السخاوی: الضوء اللامع: ج ۳، ص ۱۸۳- ۲۲۲/ ج ۱۰، ص ۱۴۴- ۱۴۷/ التحفۃ اللطیفۃ، ج ۱، ص ۱۶۱/ السمہودی: وفاء الوفاء، ج ۱، ص ۶۹۶/ الصیر فی: نزہۃ النفوس، ج ۳، ص ۳۲۴/ ابن قاضی شہبہ: تاریخ ابن قاضی شہبہ، ج ۳، ص ۲۸- ۲۹/ ابن ایبک کنز الدرر، ج ۹، ص ۲۲- ۲۹۹- ۳۴۵/ القلقشندی: صبح الاعشی، ج ۵، ص ۶۱ -۹۸، ج ۱۰، ص ۱۲۹۔ (۲) ہندوستان اور حجاز کے مابین تجارتی تعلقات سے واقفیت کے لیے دیکھیں، النجدی: السحب، ج ۲، ص ۸۸۲/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۴، ص ۳۲۱، ج ۸، ص ۱۰۳، ج ۵، ص ۱۷۵، ج ۷، ص ۱۲۵/ الفاسی: العقد الثمین: ج ۲، ص ۸۷، ج ۴، ص ۱۴۵/ ابن حجر: انباء الغمر، ج ۴، ص ۸۴۳، ہندوستان کے ساتھ تجارتی لین دین کے حوالہ سے دیکھیں السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱، ص ۶۹، ج ۷، ص ۱۳۳، ج ۱۰، ص ۱۳۶- ۱۵۴، وجیز الکلام، ج ۳، ص ۱۲۴۸/ الصیر فی: نزہۃ

النفوس، ج ۳، ص ۱۴۵/السّلفی: معجم السفر، ص ۴۳ - ۱۹۸/ابن الفرات: تاریخ ابن الفرات، ج ۸، ص ۱۸۶/ السیوطی: بغیۃ الوعاۃ، ج ۱، ص ۶۶۔ (۳) یہاں یہ اشارہ کرنا بہتر ہوگا کہ یہ ہندوستانی علمی اثر انگیزی اس مقالے میں مذکور زمانوں سے قبل بھی کئی صدیوں پرانی رہی ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل حرمین شریفین میں ہندوستانی علماء اور فضلاء کا وجود اور وہاں کی ثقافتی زندگی میں ان کا موثر کردار ہے، ان علماء میں مثال کے طور پر محمد بن ابراہیم الدیبلی (ت ۳۲۲ھ/ ۹۳۳م) جن کا شمار محدثین مکہ میں ہوتا تھا، دیکھیں الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۳۹۶ - ۳۹۷/الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ج ۱۵، ص ۹، مزید ایک دلیل یہ کہ ہندوستان کے ایک نیک دل بادشاہ بہاءالدین محمد (۶۰۰ھ/ ۱۲۰۳م) نے مکہ مکرمہ میں ابن غنایم کی خانقاہ کو صوفیوں کے لیے وقف کر دیا تھا، دیکھیں الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۱۲۳، ج ۲، ص ۲۲۳/ابن فہد: اتحاف الوری باخبار ام القری، ج ۲، ص ۵۷۰ - ۵۷۱۔ (۴) دیکھیں السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱، ص ۱۵ - ۳۶۷، ج ۳، ص ۳۰۳، ج ۴، ص ۱۵۰، ج ۵، ص ۶۹، ج ۸، ص ۸۴ - ۸۵ - ۱۲۷، ج ۱، ص ۵۲۔ (۵) دیکھیں السخاوی: الضوء اللامع، ج ۴، ص ۵۹ - ۶۰ - ۱۰۳، ج ۷، ص ۲۳۳، ج ۹، ص ۲۱۸، ج ۱۰، ص ۳۰ - ۶۹، ایضاً النعیمی: الدارس، ج ۱، ص ۱۳۰۔ (۶) ابن حجر: انباء الغمر، ج ۲، ص ۴۹۶/السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲، ص ۳۱۳، وجیز الکلام، ج ۲، ص ۴۱۷؛ التحفۃ اللطیفۃ، ج ۱، ص ۱۹۲۔ (۷) جب بنگال کے بادشاہ اعظم شاہ غیاث الدین کا انتقال ۸۱۴ھ/ ۱۴۱۱م میں ہوا تو اس کا بیٹا حمزہ اس کا جانشیں ہوا لیکن اس کے غلام شہاب الدین نے بغاوت کی اور اسے قتل کر ڈالا، جس کے نتیجہ میں ایک غیر مسلم کو جس کا نام فندر (چندر) تھا سلطنت حاصل کرنے کا موقع ملا، وہ باغی غلام کو قتل کر کے سلطنت پر قابض ہو گیا لیکن وہاں کے مسلمانوں کی قسمت نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور فندر (چندر) کے بیٹے نے ہی اپنے باپ کو قتل کر ڈالا اور زمام سلطنت سنبھال لی اور پھر مشرف بہ اسلام ہو کر اپنا نام "محمد" اور لقب "جلال الدین" رکھا اور اپنے مملکت کے حدود میں اسلامی شعائر قائم کیے، اپنے باپ کی ویران کی ہوئی مساجد کو از سر نو آباد کیا اور حنفی مسلک اختیار کیا، اس کے زمانہ میں مصر کے غلاموں کی حکومت سے سیاسی اور تجارتی تعلقات کو کافی فروغ ملا، اسی طرح اس نے حجاز سے تعلقات استوار کرنے پر بھی پوری توجہ دی اور وہاں مدرسہ قائم کیا، اہل مکہ کو ۸۳۲ھ/ ۱۴۲۸م میں کافی مال ومتاع سے نوازا، تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن حجر: انباء الغمر، ج ۲، ص ۴۹۶/الصیرفی: نزہۃ النفوس، ج ۳، ص ۴۹۷، السخاوی: الضوء اللامع، ج ۸، ص ۲۸۰، ج ۲ ص ۸۶۶، وجیز الکلام، ج ۲، ص ۵۴۳، امام سخاوی اپنی کتاب ضوء اللامع، ج ۸، ص ۲۹۳ میں ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے اس مسلم

بادشاہ کی بعض علمی کتابوں کو دیکھا ہے۔(۸) گلبرگہ کے مشہور بادشاہوں میں سے پہلا ذکر سلطان شہاب الدین احمد ابوالمغازی (ت ۸۳۸ھ/ ۱۴۳۴م) کا آتا ہے، جس نے اس آزاد مسلم ریاست میں چودہ سال حکومت کی، اس کے بعد اس کے بیٹے احمد الملقب ظفر شاہ نے حکومت کی، جس کے وصف میں ساری قدیم تاریخیں رطب اللسان ہیں کہ اپنے زمانہ کا سب سے نیک دل بادشاہ تھا ان دونوں بادشاہوں کو خوش قسمتی سے خلف بن حسن بن مہیوف جیسا عقل مند اور باعلم وزیر ملا، جو علماء سے محبت اور ان سے وابستگی نیز ان پر احسان و کرم میں کافی معروف رہا اور اس کی اس کرم فرمائی نیز دیانت داری و ورع اور کرم نیز عقل مندی اور شجاعت کی وجہ سے عربی تاریخوں کی معاصر کتابوں نے اسے اپنے زمانہ کے مایہ ناز شخصیتوں کے زمرہ میں رکھا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں الصیرفی: نزہۃ النفوس، ج ۳، ص ۳۲۴/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۳، ص ۱۸۳/ الفاسی: العقد الثمین، ج ۸، ص ۲۱۰۔(۹) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۹، ص ۲۹۱ - ۲۹۴۔(۱۰) ایضاً، ج ۳، ص ۲۲۲ - ۲۲۳۔(۱۱) ایضاً، ج ۲، ص ۱۰۵۔(۱۲) دیکھیں الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۳۰۱ - ۳۰۷، ۴۳۱ - ۴۳۲/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲، ص ۱۳۵۔(۱۳) دیکھیں الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۴۳۱۔(۱۴) الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۳۰۱ - ۴۳۱ - ۳۵۴؛ ج ۶، ص ۳۴/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۵، ص ۹۳، ج ۹، ص ۲۲۳، ج ۱۰، ص ۱۶۰/ التحفۃ اللطیفۃ، ج ۱، ص ۹۴-۱۰۶-۱۱۱-۱۱۲-۱۴۶-۱۷۷-۲۴۹-۴۲۴-۴۵۸؛ ج ۲، ص ۶۶-۸۶-۱۷۱-۱۹۸-۴۶۳-۵۶۲/ ابن فہد اتحاف الوری، ج ۴، ص ۳۶۔(۱۵) امیر مکہ کے تذکرے کے لیے دیکھیں: الفاسی: العقد الثمین، ج ۴، ص ۸۶ - ۱۳۸، ج ۳، ص ۱۳۴، اس زمانے کے بعض امراء کے تذکروں کے لیے دیکھیں: ج ۴، ص ۱۶۶ - ۱۷۴ - ۴۰۳ - ۴۲۴؛ ج ۶، ص ۵۸ - ۷۲ - ۲۰۶ - ۲۱۶/ اسی طرح السخاوی نے بھی اپنی کتاب ''التحفۃ اللطیفۃ'' میں امرائے مدینہ کی سیرت بیان کی ہے۔(۱۶) الفاسی: العقد الثمین، ج ۴، ص ۱۰۸، ج ۱، ص ۱۱۷/ ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۳، ص ۴۸۵ - ۴۸۶/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲، ص ۳۱۳ نے بیان کیا ہے کہ مدرسہ اور اس کے اوقاف کے لیے بارہ ہزار مثقال مصری خرچ کیے، دیکھیں ج ۱۰، ص ۱۶۴/ مزید معلومات کے لیے دیکھیں: ابن حجر: انباء الغمر، ج ۲، ۴۹۶/ ابن تغری بردی: المنہل الصافی، ج ۲، ص ۱۸۷/ الفاسی: شفاء الغرام، ج ۱، ص ۳۲۸ - ۳۲۹۔(۱۷) الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۱۱۷۔(۱۸) مذہب حنفی کے قاضی شہاب الدین احمد بن الضیاء الہندی مکہ کی کرسی قضاء پر ۸۰۷ھ/ ۱۴۰۴م میں فائز ہوئے اور اسی سال مالکی مذہب کے قاضی تقی الدین محمد بن احمد الفاسی کا بھی تقرر ہوا، ابن حجر: انباء الغمر، ج ۲، ص ۲۹۸۔(۱۹) ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۳،

ص ۴۸۵ - ۴۸۶/ السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۲،ص ۳۱۳/ الفاسی: العقد الثمین ، ج ا،ص ۱۱۷۔(۲۰) ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۳،ص ۴۸۶۔(۲۱) السخاوی: وجیز الکلام، ج ۳،ص ۱۰۴۷ - ۱۰۵۷۔(۲۲) الفاسی: العقد الثمین ، ج ۲،ص ۵۵ -۵۷/ السخاوی: التحفۃ اللطیفۃ ، ج ا،ص ۱۴۶/ ابن تغری بردی: المنہل ، ج ۲،ص ۱۸۲۔(۲۳) السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۵،ص ۱۱۳۔(۲۴) ایضاً، ج ۴،ص ۲۸۷۔(۲۵) السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۹، ص ۲۱۴۔(۲۶) ایضاً، ج ۸،ص ۴۷/ الفاسی: العقد الثمین ، ج ۲،ص ۱۲۴۔(۲۷) الفاسی: العقد الثمین ، ج ۴،ص ۱۳۸/ السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۵،ص ۱۷۴۔(۲۸) السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۱۰،ص ۲۴۰۔ (۲۹) الفاسی: العقد الثمین ، ج ۴،ص ۱۰۹۔(۳۰) السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۲،ص ۳۱۳۔(۳۱) السمہودی: وفاء الوفاء، ج ا،ص ۲۰۷ - ۳۰۷/ ابن حجر: انباء الغمر ، ج ۲،ص ۳۶۸/ السخاوی: التحفۃ اللطیفۃ ، ج ا،ص ۱۹۲۔ (۳۲) الصیر فی: نزہۃ النفوس، الابدان، ج ۳،ص ۳۲۴/ الفاسی: العقد الثمین ، ج ۸،ص ۲۱۰/ السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۱۰،ص ۱۱۷۔(۳۳) ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۳،ص ۶۴۳؛ ج ۴،ص ۴۵۔ص ۲۴۔(۳۴) قعیقعان: مکہ کی ایک پہاڑی جو مسجد حرام کے سامنے شمال وغرب شمال کی جہت پر واقع ہے،اور مختلف ناموں سے مشہور ہے، مکہ کی اونچائی والے حصہ کو''جبل العبادی''اور''جبل السلیمانیۃ'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جنوبی حصہ کو ''جبل ہندی'' کہا جاتا ہے، شام کی طرف واقع حصہ کو''جبل القرارۃ''اور جبل فلفلۃ'' کہتے ہیں اور ان سب کو مجموعی طور پر''جبل قعیقعان'' کے نام سے موسوم کیا گیا، ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۴،ص ۲۵ - ۲۶۔(۳۵) ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۴،ص ۲۵ - ۲۶۔(۳۶) السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۵،ص ۹۳۔(۳۷) ایضاً،ص ۲۳۔(۳۸) ایضاً، ج ۱۰،ص ۲۰۳؛ ج ۳،ص ۱۲۷؛ ج ۵،ص ۷۵، جہاں گلبرگہ سے لوگ علم حاصل کرنے کے لیے حرمین شریفین کا سفر کرتے تھے، وہیں اہل مکہ و مدینہ بھی گلبرگہ کا علمی سفر کرتے تھے، تفصیل کے لیے دیکھیں: السخاوی: الضوء اللامع ، ج ا،ص ۲۸۱؛ ج ۵،ص ۱۷۵/ الفاسی: العقد الثمین : ج ۲،ص ۸۷؛ ج ۴،ص ۱۳۷ - ۱۳۸/ النجدی: السحب الوابلۃ ، ج ۲ ،ص ۵۱۲/ اسی طرح مصری علما نے بھی گلبرگہ اور دوسرے ہندوستانیوں نے اسلامی ریاستوں کا علمی سفر کیا، السخاوی: وجیز الکلام، ج ۲،ص ۴۸۲۔(۳۹) السخاوی: وجیز الکلام، ج ۲،ص ۴۹۸۔(۴۰) السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۸،ص ۲۸۰/ وجیز الکلام، ج ۲،ص ۵۳۴ - ۵۳۵/ ہوسکتا ہے کہ اس مدرسہ کا نام''جدید بنگالی مدرسہ'' رہا ہوتا کہ مدرسہ بنگالیہ غیاثیہ سے تمیز ہوسکے، دیکھیں السخاوی: الضوء اللامع ، ج ۸،ص ۴۷/ الفاسی: العقد الثمین ، ج ۲،ص ۱۲۴۔(۴۱) السمہودی: وفاء الوفاء، ج ا،ص ۶۹۶/

السخاوی: التحفۃ اللطیفۃ، ج ۱،ص ۱۶۱، گلبرگہ کے بادشاہ نے مسجد نبوی میں روشنی کرنے کے لیے خاص بہت نفیس قسم کے فانوس اور قندیل بھی بھیجے تھے۔(۴۲) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱۰،ص ۱۴۸/صاحب الضوء کا بیان ہے کہ صاحب مندوہ کا انتقال ۸۰۰ھ/ ۱۳۹۷م کچھ میں ہوا، یہ اپنے کرم وفیاضی میں بہت معروف تھا، اس کی موت کے بعد مکہ میں آنے والی عطیات کا سلسلہ منقطع ہو گیا،ص ۱۴۹۔(۴۳) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۹،ص ۲۲۳۔ (۴۴) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱۰،ص ۱۶۶۔(۴۵) ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۴،ص ۴۴۳۔(۴۶) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲،ص ۱۰۵۔(۴۷) السخاوی: التحفۃ اللطیفۃ، ج ۲،ص ۳۷۶/کنبایہ میں وارد ہونے والے علماء کے متعلق مزید تفصیل کے لیے دیکھیں السخاوی: سابقہ حوالہ، ج ۵،ص ۱۱۳۔(۴۸) ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۳،ص ۳۴۵، مکہ مکرمہ کی تجارتی بندرگاہ جدہ اور کنبایہ کے مابین کافی گہرے تجارتی تعلقات قائم تھے، السخاوی: وجیز الکلام، ج ۳،ص ۱۲۴۸۔(۴۹) الفاسی: العقد الثمین، ج ۴،ص ۱۰۴۔(۵۰) الفاسی: العقد الثمین، ج ۲،ص ۳۵۰- ۴۱۴، ج ۴،ص ۱۵۵- ۲۵۴- ۳۸۵/السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱۰،ص ۴۵۔ (۵۱) الفاسی: سابقہ حوالہ، ج ۶،ص ۲۳۱- ۴۵۶/السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲،ص ۲۰۵- ۲۱۰- ۲۳۰؛ ج ۵، ص ۶۷- ۲۳۶- ۳۰۷- ۳۱۲، ج ۶،ص ۱۴۶، ج ۷،ص ۱۰۵، ج ۹،ص ۲۲، ان معاصر تاریخی کتابوں نے اس خانقاہ کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وقف شدہ کتابوں کے وجود کی بھی صراحت کی ہے۔(۵۲) الفاسی: سابقہ حوالہ، ج ۴،ص ۴۱۸، ج ۶،ص ۱۳۱/السخاوی: الضوء اللامع، ج ۸،ص ۵۸۔(۵۳) الفاسی: سابقہ حوالہ، ج ۶،ص ۴۵۶۔(۵۴) الفاسی: سابقہ حوالہ، ج ۱،ص ۴۵۴، ج ۶،ص ۲۰۴، ان معاصر تاریخی کتابوں نے خانقاہ کے کتب خانہ میں موجود فہرست شدہ کتابوں کی صراحت کی ہے، السخاوی: الضوء اللامع، ج ۳،ص ۲۱۷- ۳۱۲، ج ۵،ص ۱۴۳، ج ۷،ص ۲۵۲، ج ۱۰، ۵۵- ۱۲۳۔(۵۵) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۵،ص ۱۷۴، ج ۷،ص ۲۵۳، اس خانقاہ میں بھی کتب خانے کے وجود کی طرف معاصر حوالوں نے اشارہ کیا ہے۔(۵۶) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱،ص ۳۴۸؛ بیان کیا جاتا ہے کہ بہت سارے فقہاء اس خانقاہ میں رہتے تھے، سابقہ حوالہ ملاحظہ کریں، ج ۱،ص ص ۳۰۸؛ ج ۵،ص ۱۷۴- ۲۳۶؛ ج ۷،ص ۱۰۵/الفاسی: العقد الثمین، ج ۲،ص ۴۱۸؛ ج ۶،ص ۱۳۱۔(۵۷) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۸،ص ۸۸۔(۵۸) الفاسی: العقد الثمین، ج ۶،ص ۳۴۔(۵۹) ایضاً، ج ۱،ص ۱۲۱۔(۶۰) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۳،ص ۲۵۷- ۳۰۳۔(۶۱) الفاسی: العقد الثمین، ج ۸،ص ۲۱۰۔(۶۲) الفاسی: العقد الثمین، ج ۱،ص ۴۰۹- ۴۱۰، یہاں

یہ بھی ذکر ہے کہ شیخ غیاث الدین کو علم طب میں بھی معرفت اور مہارت تھی اور اس صنف میں ان کی کئی نفیس کتابیں بھی ہیں، مکہ مکرمہ میں لوگوں نے ان سے خوب علمی استفادہ کیا، وہ لوگوں کو دوائیں بھی دیتے تھے، ان کا انتقال مکہ میں ۸۰۵ھ / ۱۴۰۲م میں ہوا، الفاسی: حوالہ سابق، ج ۱، ص ۱۴۱ ۔ (۶۳) السخاوی: التحفۃ اللطیفۃ، ج ۱، ص ۱۶۱ ۔ (☆) مسلمان بادشاہوں کی علمی اور علم پروری کی بدولت ہندوستان میں علماء اور صوفیہ حضرات کو قدم جمانے کا اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا اور ہر دور میں بکثرت علماء پیدا ہوتے رہے، سلاطین دہلی کی حکومت میں سب سے زیادہ علماء علاء الدین خلجی کے دور میں تھے، ان کا اتنا شاندار اجتماع ہو گیا تھا کہ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ اس وقت کی اسلامی دنیا یعنی حرمین شریفین، بخارا، سمرقند، مصر، شام، خوارزم، تبریز، اصفہان، شیراز اور روم میں یہاں کے جیسے علماء نہیں پائے جاتے تھے اور ان علماء میں سے اکثروں نے حجاز کا سفر کیا جن میں سے اچھی خاصی تعداد حرمین میں تعلیمی و تدریسی کام میں لگی رہی، سید صباح الدین عبدالرحمان: ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، طبع دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ ۲۰۰۱ء، ص ۹ - ۱۰، مترجم ۔ (۶۴) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۳، ص ۲۲۲، ج ۱۰، ص ۱۴۸ ۔ (۶۵) ایضاً، ص ۱۵۰ ۔ (۶۶) ایضاً، ص ۲۲ ۔ (۶۷) ایضاً / الفاسی: العقد الثمین، ج ۴، ص ۱۷۶ / الکتبی: فوات الوفیات، ج ۱، ص ۳۵۹ ۔ (۶۸) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱، ص ۲۹۸، ج ۲، ص ۱۶۶ - ۱۶۷ ۔ (۶۹) ایضاً، ج ۵، ص ۶۹؛ ج ۸، ص ۸۴؛ ج ۱۰، ص ۵۲ ۔ (۷۰) ایضاً، ج ۱، ص ۳۶۷؛ ج ۸، ص ۸۵ ۔ (۷۱) ابن حجر: الدرر الکامنۃ، ج ۵، ص ۲۴۸ / انباء الغمر، ج ۱، ص ۲۷ / السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱، ص ۳۲۵؛ ج ۲، ص ۲۳۱؛ ج ۴، ص ۱۰ - ۳۰ ۔ (۷۲) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۸، ص ۱۲۷ ۔ (۷۳) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱، ص ۱۵، ج ۲، ص ۴۴؛ ج ۳، ص ۳۰۳ / ایضاً، الصفدی: الوافی، ج ۳، ص ۲۳۹ / المقریزی: المقفی، ج ۶، ص ۶۸ / درر العقود، ج ۱، ص ۲۹۱ - ۴۲۰ ۔ (۷۴) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۴، ص ۴۰ ۔ (۷۵) ایضاً، ج ۱۰، ص ۶۹ ۔ (۷۶) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۴، ص ۱۰۳، صفدی نے ان کا وصف بیان کیا ہے کہ آپ بہت ہی فصیح اور بلیغ عالم تھے ۔ (۷۷) السخاوی: الضوء اللامع ج ۷، ص ۲۳۳؛ ج ۱۰، ص ۳۰، یہاں یہ ذکر کر دینا بہتر ہوگا کہ اس وقت سراج نام کے دو عالم معروف تھے، السخاوی: الضوء اللامع، ج ۹، ص ۲۱۸ ۔ (۷۸) النعیمی: الدارس فی تاریخ المدارس، ج ۱، ص ۱۳۰ ۔ (۷۹) الفاسی: العقد الثمین، ج ۲، ص ۲۹۱ - ۲۹۲ / السخاوی: وجیز الکلام، ج ۱، ص ۲۴۱ ۔ (۸۰) الفاسی: العقد الثمین، ج ۶، ص ۳۵۵ - ۳۵۶ ۔

(۸۱) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۹، ص ۱۵۔ (۸۲) ابن حجر: انباء الغمر، ج ۳، ص ۲۹۸۔ (۸۳) یہ مدرسہ امیر فخر الدین المعروف بالزنجیلی سے منسوب ہے، یہ صاحب سلطان صلاح الدین ایوبی کے امیروں میں سے تھے، یہ مدرسہ باب العمرۃ پھر واقع تھا، الفاسی: العقد الثمین، ج ۶، ص ۳۴/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۳، ص ۱۳۷۔ (۸۴) الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۱۱۷ - ۱۱۸۔ (۸۵) السخاوی: التحفۃ اللطیفۃ، ج ۱، ص ۱۴۶/ الضوء اللامع، ج ۲، ص ۱۷۹/ المقریزی: درر العقود، ص ۴۲۹ - ۴۳۰/ ایضاً، ابن تغری بردی: المنہل الصافی، ج ۲، ص ۱۸۲۔ (۸۶) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲، ص ۱۹۱۔ (۸۷) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۷، ص ۸۵۔ (۸۸) ان کتابوں کی تفصیل کے لیے دیکھیں السخاوی: الضوء اللامع، ج ۷، ص ۸۵۔ (۸۹) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۷، ص ۸۵۔ (۹۰) ایضاً، ج ۹، ص ۱۹۱۔ (۹۱) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۷، ص ۸۶۔ (۹۲) ایضاً۔ (۹۳) ایضاً، ج ۲، ص ۱۶۷ - ۱۳۷؛ ج ۴، ص ۱۸۷ - ۱۸۸۔ (۹۴) ایضاً، ج ۶، ص ۲۴۲۔ (۹۵) ایضاً، ج ۱، ص ۸۸۔ (۹۶) الفاسی: العقد الثمین، ج ۴، ص ۱۸۷ - ۱۸۸/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۳، ص ۳۷۔ (۹۷) السخاوی: وجیز الکلام، ج ۲، ص ۴۷۔ (۹۸) السخاوی حوالہ سابق، ج ۱، ص ۲۸۳۔ (۹۹) سلاطین دہلی کے زمانہ میں حرمین شریفین میں بچوں کی تعلیم وتربیت کا بڑے پیمانہ پر نظام قائم تھا اور ان بچوں کو حرمین کے دروازوں اور میناروں کے نیچے تعلیم دی جاتی تھی، الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۴۱۳ - ۴۳۳ - ۴۳۵؛ ج ۲، ص ۳۱۴؛ ج ۴، ص ۸۵؛ ج ۸، ص ۱۷ - ۹۵/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲، ص ۱۰۹؛ ج ۳، ص ۱۰۲؛ ج ۵ ص ۸۹؛ ج ۹ ص ۱۳۴ - ۱۶۶ - ۱۸۳/ مسجد نبوی میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے دیکھیں: السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱۰، ص ۲۳ - ۲۴؛ التحفۃ اللطیفۃ ج ۱، ص ۹۴ - ۴۵۳؛ ج ۲، ص ۱۳۵ - ۳۵۹ - ۵۰۵۔ (۱۰۰) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱۰، ص ۱۶۹۔ (۱۰۱) الفاسی: العقد الثمین، ج ۲، ص ۲۹۱۔ (۱۰۲) السخاوی: التحفۃ اللطیفۃ، ج ۲، ص ۳۵۲، ان کے مختصر تذکرہ کے لیے دیکھیں: الفاسی: العقد الثمین، ج ۶، ص ۳۵۴۔ (۱۰۳) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۷، ص ۲۲۳؛ امام سخاوی کا بیان ہے کہ مسجد نبوی کے اکثر خدام ہندوستانی نژاد ہوتے تھے، جن میں سے اکثر اپنے وقت کے بڑے عالم بھی ہوتے تھے، الضوء اللامع، ج ۳، ص ۱۷۳۔ (۱۰۴) السخاوی: وجیز الکلام، ج ۱، ص ۲۴۱۔ (۱۰۵) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۳، ص ۲۹۰۔ (۱۰۶) ایضاً، ج ۲، ص ۱۷۹ - ۱۳۷/ التحفۃ اللطیفۃ، ج ۱، ص ۱۴۶۔ (۱۰۷) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۸، ص ۵۶/ الفاسی: العقد الثمین، ج ۸، ص ۲۸؛ ج ۸، ص ۱۶۳۔ (۱۰۸) الفاسی: العقد الثمین، ج ۲، ص ۳۱۹۔

(۱۰۹) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۱، ص ۳۰۴۔ (۱۱۰) ایضاً، ج ۴، ص ۱۰۳۔ (۱۱۱) الفاسی: العقد الثمین، ج ۲، ص ۳۴۰ - ۳۴۲۔ (۱۱۲) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲، ص ۱۶۷ - ۱۷۵۔ (۱۱۳) ایضاً، ج ۱، ص ۸۸ - ۸۹ - ۹۹۔ (۱۱۴) الفاسی: العقد الثمین، ج ۸، ص ۱۹۰۔ (۱۱۵) ایضاً، ج ۲، ص ۱۹۰۔ (۱۱۶) ایضاً، ص ۳۴۰ - ۳۴۲۔ (۱۱۷) ایضاً، ص ۳۱۹۔ (۱۱۸) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲، ص ۲۰۷ - ۳۲۱؛ ج ۳، ص ۱۲۷ - ۲۳۲؛ ج ۱۰، ص ۲۱ - ۲۰۳/الفاسی: العقد الثمین، ج ۲، ص ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۲۲ - ۳۳۲۔ (۱۱۹) الفاسی: العقد الثمین، ج ۲، ص ۲۹۲۔ (۱۲۰) ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۳، ص ۳۴۷، وفیات ۷۸۶ھ/ ۱۳۸۴م۔ (۱۲۱) السخاوی: الضوء اللامع، ج ۸، ص ۱۰۳۔ (۱۲۲) الفاسی: العقد الثمین، ج ۱، ص ۴۱۲/ السخاوی: الضوء اللامع، ج ۷، ص ۱۳۲۔ (۱۲۳) ان میں سرفہرست الضیاء الہندی تھے، الفاسی حوالہ سابق، ج ۲، ص ۲۹۲/السخاوی: وجیز الکلام، ج ۱، ص ۱۴۱/ نیز محبّ محمد الہندی کا نام بھی آتا ہے، السخاوی، وجیز الکلام، ج ۱، ص ۲۸۳/ یہاں یہ اشارہ کر دینا بہتر ہوگا کہ ہندوستانی بادشاہوں میں غیاث الدین الغوری جو قسیم امیر المومنین کے لقب سے معروف نیز عدل وانصاف اور علماء پروری میں مشہور تھا، الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ج ۲۱، ص ۳۲۱ھ، اس سے بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ہندوستان میں اس طرح کا تعصب کافی منتشر تھا جس نے ایک بادشاہ کو اس کی مذمت کرنے پر ابھارا۔ (۱۲۴) جس میں مثال کے طور پر ہندوستانی سلاطین وبادشاہوں کا اہل حرمین شریفین کو مال ودولت بھیجنا، نیز امرائے مکہ اور مکہ کے اماموں اور قاضیوں کو گراں قدر تحائف بھیجنا بھی ہے، الفاسی: العقد الثمین، ج ۴، ص ۱۰۴/السخاوی: الضوء اللامع، ج ۲، ص ۳۱۳، ج ۳، ص ۸۸۳ - ۲۲۲، ج ۸، ص ۲۸۰؛ وجیز الکلام، ج ۲، ص ۴۹۸؛ ابن فہد: اتحاف الوری، ج ۴، ص ۴۴/ یہاں یہ ذکر کرنا بہتر ہوگا کہ معاصر تاریخی تذکرے کی کتابوں میں حرمین شریفین میں موجود عام ہندوستانیوں کی عمومی کارکردگیوں کے تئیں بیانات بھی موجود ہیں، جن میں سے ایک بیان امام سخاوی (الضوء اللامع، ج ۳، ص ۱۵۳) کا مکہ مکرمہ میں موجود ہندوستانی معماروں میں سے ایک معمار حسین بن عمر الہندی کے متعلق ہے، جن کا انتقال مولف کے بیان کے مطابق ۸۷۰ھ/ ۱۴۵۵م میں ہوا، اس کے علاوہ ان معاصر عربی تذکرے کی کتابوں میں مختلف حرفوں اور تجارتی مجال میں ہندوستانیوں سے متعلق کافی بیانات موجود ہیں، جنہیں اس مقالے میں پیش کرنے سے مقالہ نگار نے گریز کیا ہے کیوں کہ یہ اس مقالے کے دائرہ سے باہر ہیں۔

کتابیات

ابن ایبک (ابوبکر بن عبداللہ ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵): کنز الدرر و جامع الغرر، ج ۹، تحقیق ہانس روبرت، المعھد الامانی للآثار بالقاہرۃ۔

ابن تغری بردی (جمال الدین یوسف ۸۷۴ھ/ ۱۴۶۹): المنہل الصافی والمستوفی بعد الوافی، ج ۲، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب۔

ابن حجر (شہاب الدین احمد بن علی ۸۲۵ھ/ ۱۴۴۸): الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ، تحقیق محمد سید جاد الحق، دار الکتب الحدیثۃ۔

انباء الغمر بانباء العمر، تحقیق، پروفیسر حسن حبشی، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیۃ۔

الذہبی (شمس الدین محمد بن احمد ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷): سیر اعلام النبلاء، تحقیق عدۃ محققین، موسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

السخاوی (شمس الدین محمد بن عبدالرحمان ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۶م): الضوء اللامع لاہل القرن التاسع، دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت۔

وجیز الکلام فی الذیل علی دول الاسلام، تحقیق بشار عواد و عصام الحرستانی و احمد الخطیمی، موسسۃ الرسالۃ، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵م۔

التحفۃ اللطیفۃ فی تاریخ المدینۃ الشریفۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳م۔

السّلفی (الحافظ ابوطاہر احمد بن محمد ۵۷۶ھ/ ۱۱۸۰م): معجم السفر، تحقیق عبداللہ البارودی، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳م۔

السمہودی (نور الدین علی بن احمد ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵م): وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان۔

السیوطی (جلال الدین عبدالرحمان ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵م): بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، المکتبۃ العصریۃ، صیدا، بیروت۔

الصفدی (صلاح الدین خلیل ۷۶۴ھ/ ۱۳۶۲م): الوافی بالوفیات، ج ۳، اعتناء، س- دیدرینغ۔

ابن الصیرفی (علی بن داؤد ۹۰۰ھ/ ۱۴۹۴م): نزہۃ النفوس والابدان فی تواریخ الزمان، تحقیق پروفیسر حسن حبشی، دار الکتب، ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰م

الفاسی (محمد بن احمد الحسنی ۸۳۲ھ/ ۱۴۲۸م): شفاء الغرام باخبار البلد الحرام، تحقیق پروفیسر عمر عبدالسلام تدمری، دار الکتاب العربی ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵م۔

العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین، تحقیق عدۃ محققین، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ۔
ابن الفرات (محمد بن عبدالرحیم ۸۰۷ھ/ ۱۴۰۴م): تاریخ ابن الفرات، ج ۸، تحقیق پروفیسر قسطنطین زریق وپروفیسر نجلاء عزالدین۔
ابن فہد (محمد بن محمد بن محمد بن فہد ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰م): اتحاف الوری باخبار ام القری، تحقیق پروفیسر عبدالکریم علی بار، السعودیۃ، جامع ام القری، مرکز احیاء التراث الاسلامی، مکۃ المکرّمۃ۔
ابن قاضی شہبہ (قضی الدین ابوبکر احمد ۸۱۵ھ/ ۱۴۴۸م): تاریخ ابن شہبہ، تحقیق عدنان درویش، دمشق ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷م۔ القلقشندی (ابوالعباس احمد بن علی ۸۲۱ھ/ ۱۴۱۸م): صبح الاعشی فی صناعۃ الانشاء، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵م۔
الکتبی (محمد بن شاکر ۷۶۴ھ/ ۱۳۶۲م): فوات الوفیات، تحقیق پروفیسر احسان عباس، دارصادر بیروت۔
المقریزی الکبیر، تحقیق الاستاذ محمد الیعلاوی، دارالغرب، بیروت۔
درر العقود الفریدۃ فی تراجم الاعیان المفیدۃ، دراسۃ وتحقیق پروفیسر محمد کمال الدین عزالدین، عالم الکتاب، بیروت، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲م۔
النجدی (محمد بن عبداللہ بن حمید): السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ، تحقیق بکر عبداللہ ابوزید و پروفیسر عبدالرحمان العثیمین، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۶م۔
النعیمی (عبدالقادر بن محمد ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۰م): الدارس فی تاریخ المدارس، تحقیق جعفر الحسنی۔

علمی محاسبہ ومحاکمہ کے معیار

ڈاکٹر سید عبدالباری

علمی محاسبہ ومحاکمہ اور کسی اختلافی موضوع پر بحث مباحثہ کے آداب اور حدود و قیود پر کافی گفتگو ہمارے بزرگ کر چکے ہیں اس لیے کہ اس میدان میں طرح طرح کی زیادتیوں کے سبب امت میں انتشار اور تفریق کے افسوس ناک واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ تیسری صدی ہجری ہی سے اس طرح کے واقعات مسلسل سامنے آتے رہے ہیں جب علمی محاسبہ میں افراط و تفریط نے مناظرانہ رنگ اختیار کیا اور پھر جستجوئے حق کے بجائے علمی برتری کے جنون اور غرور نفس نے بڑا مکروہ منظر پیش کیا ہے۔ ماضی میں اسلامی ممالک میں حکمران کو خوش کرنے اور جلب منفعت کی خاطر کچھ اہل علم اپنی طلاقت لسانی کے مظاہرہ کو علمی محاسبہ تصور کرنے لگے۔ عام طور پر مختلف ائمہ کے مسالک کے درمیان جزوی اختلافات پر سارا زور بیان صرف کیا جانے لگا۔ امام ابو حامد الغزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ تاریخ اسلام میں "کچھ سربراہان مملکت اور امراء و حکام علم کلام سے دل چسپی رکھتے ہیں تو وہ لوگ علم کلام کا مطالعہ کرنے لگے۔ بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ مناظرانہ بحثوں کے طریقے ایجاد کیے گئے۔ فریق ثانی پر اعتراضات کرنے کے لیے نئے نئے ڈھنگ وضع کیے گئے اور یہ دعوی کیا گیا کہ اس طرح ہم دین الٰہی کا دفاع، سنت رسولؐ کی حفاظت اور بدعت کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ آئے جو فقہ میں مناظرانہ بحثوں کا ذوق رکھتے تھے۔ انہیں یہ معلوم کرنے میں دل چسپی تھی کہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے مذاہب میں سے کون سا مذہب بہتر ہے۔ علماء نے اس ذوق کی تکمیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ علم کلام اور دوسرے علوم وفنون کو بالائے طاق رکھ کر فقہی اختلافات کی ترتیب وتدوین کا آغاز ہوا۔ علماء اس

E/۳، شاہین باغ، نئی دہلی، ۲۵۔

غلط فہمی کا شکار رہے کہ ہم شرعی احکام کے اسرار و رموز کی دریافت، مذہبی اختلافات کے اسباب و عوامل کے اثبات اور فتاویٰ کے اصولوں کی تشکیل پر مامور ہیں۔ان کی کتابوں میں مناظرانہ رنگ کے مباحث درج ہیں۔(جلد اول،ص ۸۹)

امام غزالی کو افسوس ہے کہ علماء فرض عین پر فرض کفایہ کو ترجیح دینے لگے۔وہ فرض کفایہ میں اہم و غیر اہم کا فرق بھی نظر انداز کرنے لگے۔وہ ابن ماجہ سے حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں :''جب تم میں سے لوگوں میں مداہنت پیدا ہوجائے گی اور بُروں میں بے حیائی، حکومت چھوٹوں کی طرف منتقل ہوجائے گی اور فقہ رذیلوں میں چلا جائے گا اس وقت امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھوڑ دیے جائیں گے''۔

علمی محاسبہ و محاکمہ کے لیے ضروری ہے کہ انسان صاحب علم ہو اور معروضیت پر سختی سے کاربند ہو۔امام غزالی کے مطابق بحث و مباحثہ دینی امور میں کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مجتہد ہو اور اپنی رائے دینے کی اہلیت رکھتا ہو نہ کہ کسی مذہبی مسلک کا پابند ہو کر اس کے دفاع میں اپنی رائے ظاہر کرے۔امام کی رائے میں اس شخص سے مباحثہ و مناظرہ کا کیا حاصل جو اجتہاد کا اہل نہیں اور ہر معاملہ میں کسی مسلک کی تقلید اور اس کے دفاع پر کاربند ہے۔

علمی محاسبہ اور محاکمہ اسی وقت سودمند ہے جب کہ اس کا مقصد افہام و تفہیم ہو اور یہ کسی مجمع میں ممکن نہیں جہاں دو طرفہ واہ واہ اور ہائے ہائے کا نعرہ لگانے والوں کا ہجوم ہے۔علمی محاسبہ و محاکمہ کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے دل میں امام غزالی کے الفاظ میں طلب حق موجود ہو اور اس کی حالت اس شخص کی ہو جس کی کوئی چیز گم ہوگئی ہو اور وہ یہ فرق نہ کرے کہ وہ چیز خود اس کے ذریعہ مل رہی ہے یا کسی اور کے ذریعے سے۔کوئی بھی علمی محاسبہ اس صورت میں لاحاصل ہے جب کہ انسان فریق مخالف کو کاٹ کھانے پر آمادہ ہو۔

علمی محاسبہ و محاکمہ اسی صورت میں مفید ہوسکتا ہے جب کہ اس کی غایت کسی کو شکست دینا یا نیچا دکھانا نہ ہو بلکہ استفادہ کی خاطر اسی وادی میں قدم رکھا جائے یعنی اس کے ذریعہ انسان اپنے علم میں اضافہ اور حق تک رسائی کا آرزومند ہو۔ورنہ حسد، کبر، کینہ، غیبت، عیب جوئی، ریاکاری، نفاق وغیرہ عیوب کے ساتھ کسی طرح کے محاسبہ و محاکمہ کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں۔

آداب بحث واختلاف میں اولین شرط معروضیت ہے۔ یعنی انسان اپنے جذبات اور نفس کے تقاضوں سے حتی الامکان کنارہ کش رہے۔ گفتگو میں جب جذبات کو دخل ہوتا ہے تو انسان کے لیے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ محاکمہ میں مخالف کی باتوں کو صحیح طور پر نقل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یادش بخیر جس زمانہ میں مذہبی حلقوں کی طرف سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر اعتراضات بلکہ تکفیر کی مہم اپنے شباب پر تھی اور مسلسل کتابیں شائع کی جارہی تھیں جن میں جو کچھ لکھا جارہا تھا وہ نہایت غیر معتبر ہوتا تھا۔ بالعموم مولانا کی عبارت کے کسی ٹکڑے کو اس حکمت کے ساتھ اپنے سیاق سے الگ کر کے پیش کر دیا جاتا، کچھ کے کچھ معنی برآمد کر لیے جاتے۔ حیرت ہے کہ اپنی علمی و دینی ذمہ داریوں کو لوگوں نے بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ جب کہ تنقید و تحقیق کے میدان میں پہلا قدم اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ قطعیت Accuracy کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے یعنی مندرجات کی انتہائی صحت کا اہتمام کیا جائے۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ انسان کو اپنی زبان (یا قلم) کو اپنے قابو میں رکھنے کی ہدایت دی گئی ہے اور زبان وقلم کی بے احتیاطی کو ہزار فتنوں کی جڑ قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ النور آیت ۱۵ میں واقعہ افک کے حوالے سے سخت تنبیہ کی گئی ہے:

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۔	جب کہ تم اپنی زبانوں سے نقل در نقل کرنے لگے اور اپنے منہ سے وہ بات نکالنے لگے جس کی تمہیں مطلق خبر نہ تھی گو تم اسے ہلکی بات سمجھتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بہت بڑی بات تھی۔

سورۂ بنی اسرائیل آیت ۵۳ میں ہدایت دی گئی ہے:

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ اِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۔	اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بہت ہی اچھی بات منہ سے نکالا کریں، کیوں کہ شیطان آپس میں فساد ڈلواتا ہے۔ بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اسی ہدایت کا مفہوم یہ ہے آپس میں گفتگو کے وقت زبان کو احتیاط کے ساتھ استعمال

کریں، اچھے کلمات بولیں، مومن ہوں یا کفار ومشرکین سب سے مشفقانہ اور نرم لہجے میں گفتگو کریں۔ مولانا مودودی اس آیت کی تشریح کرتے ہیں ''مخالفین خواہ کیسی ہی ناگوار بات کریں مسلمانوں کو بہرحال نہ کوئی بات خلاف حق زبان سے نکالنی چاہیے اور نہ غصے میں آپے سے باہر ہوکر بیہودگی کا جواب بیہودگی سے دینا چاہیے۔ انہیں ٹھنڈے دل سے وہی بات کہنی چاہیے جو جچی تلی ہو اور ان کی دعوت کے وقار کے مطابق ہو''۔ شیطان کی اولین کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی پرفریب باتوں سے لوگوں کو بہکائے۔ سورہ بنی اسرائیل میں شیطان کی اس چال کا ذکر ہے۔

وَاسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ تو جیسے بھی اپنی آواز سے بہکا سکے بہکا لے۔

انسان کی ذہنی تربیت اگر سلیقہ سے نہ ہو تو وہ اشتعال پذیری کی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے اور طرح طرح کی خفیف الحرکتی، چھچھورے پن، چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے لڑنے مرنے کی ذہنیت، طالع آزمائی، ذہنی بے مائیگی کا شکار ہوجاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ایسے لوگوں کو مسرف ومرتاب کہا گیا ہے:

سورۂ مومن کی آیت ۳۵، ۳۶ میں ارشاد ہوا ہے: ''اس طرح اللہ انہیں گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑتے رہتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ایسے متکبر وجبار کے دل پہ ٹھپہ لگا دیتا ہے۔

صاف ستھری علمی تحقیق وجستجو علمی محاسبہ ومحاکمہ کی اولین شرط ہے۔ مگر انسان بدقسمتی سے تعصب یا اظہار شخصیت کی وجہ سے اس راہ پر گامزن نہیں ہو پاتا۔ آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ وہ جو کچھ جانتا ہے اسی کو پورا اور مکمل علم تصور کرنے لگتا ہے۔ بیمار ذہنیت اور ناقص تربیت اسے جادہ اعتدال سے دور کر دیتی ہے۔ وسعت نظر وفراخ دلی کی دولت سے ہمارا معاشرہ بدقسمتی سے اس دور زوال میں محروم کر دیا گیا ہے۔ علامہ محمد غزالی اپنی کتاب شاہرہ اعتدال میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں:

''میں نے ایک شیخ کو کہتے سنا کہ حسن البناؒ کے طرز فکر میں شرک در آیا تھا کیونکہ انہوں نے دعا میں رسول اکرمؐ کا وسیلہ اختیار کرنے کو فروعی مسائل میں شمار کیا ہے۔ میں نے کہا اگر کوئی

مسلمان اپنے نبی کے واسطے سے اپنے رب سے دعا کرے تو کیا وہ شرک ہو جائے گا؟ اگر تم تشدد اختیار کرو تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کہ اس نے دعا کے مسنون طریقوں میں سے کمزور طریقہ اختیار کیا۔ اس سے کفر و شرک کیسے لازم آجائے گا''۔ (شاہراہ اعتدال ۲۲۵، مکتبہ اشاعت القرآن دہلی ۶)

محاسبہ و محاکمہ میں انسان اس وقت افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے جب وہ کسی زیر بحث مسئلہ یا عبارت کے بجائے اس کے لکھنے یا کہنے والے سے عقیدت میں گرفتار ہو۔ اختلاف اس وقت سنگین نوعیت اختیار کر لیتا ہے جب کچھ لوگ کسی بھی خیال کے بارے میں یہ تصور کرنے لگتے ہیں کہ وہ عقاید میں شامل ہے۔ امام حسن البناء لکھتے ہیں: ''رسول اللہؐ کی معصوم شخصیت کے سوا ہر شخص کی بات مانی یا چھوڑی جاسکتی ہے۔ لیکن ہم اسلاف میں سے کسی شخص کو ہدف ملامت نہیں بناتے بلکہ ان کو ان کی نیتوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے اعمال کے ساتھ جہاں جانا چاہتے تھے جا چکے'' (شاہراہ اعتدال ۱۶۵)، محمد غزالی کے الفاظ میں اختلافی مسائل میں صاف ستھری علمی تحقیق و جستجو میں کوئی حرج نہیں لیکن اسے تعصب یا اظہار شخصیت و اہمیت کا ذریعہ بنانا قابل مذمت ہے'' بحث و مجادلہ میں اختلاف کی خلیج کو وسیع کرنے میں جاہل صوفیہ اور خود کو عالم دین کہنے والے جہلا کا بڑا دخل رہا ہے۔ معمولی معمولی اختلافات کی چنگاریوں کو کچھ لوگوں نے شعلہ جوالہ بنانے کی کوششیں کی ہیں۔ بقول محمد غزالی کچھ لوگ بظاہر دین کے لیے جوش میں آتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ اپنی بیمار ذہنیت اور ناقص تربیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح کی بحثوں کو وہ اپنے گندے خیالات کو چھپانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ایسے ہی لوگوں کے لیے آیا ہے:

اِنْ فِیْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا کِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِیْهِ ۔ (المومن:۵۶)	ان لوگوں کے دل میں کبر بھرا ہوا ہے مگر وہ بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ کرتے ہیں۔

اسلام نے انسان کو غور و فکر اور بحث و تبادلہ خیالات کی آزادی مکمل طور پر عطا کی ہے لیکن اس نے اختلاف کی شائستگی اور اس کے حدود کی بھی نشان دہی کی ہے۔ دین مبین میں غور و فکر اور عقلی کاوشوں کی سرحدیں کافی وسیع ہیں لیکن اس کے لیے ایک واضح نقطہ نظر اور اقدار کا ایک نظام بھی عطا کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے رائے اور اس کے اظہار کی آزادی جو ابتدائی عہد میں

مسلمانوں کی زندگی میں فکر و عمل کا ایک مضبوط ستون تھی بعد میں اسے سلب کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ اور ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی کے الفاظ میں ''فکری بحران، ثقافتی غیر حاضری، سیاسی جبر اور خود شناسی کے فقدان کا ظہور ہوا''۔ (آزادی رائے کا کردار، مقدمہ ص ۱۱) اور امت مسلمہ پختہ دماغی سے محروم ہوتی گئی۔ عقل کے محاصرے اور اس کی تحقیر، فکر کا مذاق اڑانے اور تقلید و تابع داری کے مزاج کو فروغ دیا جانے لگا۔ گروہوں، تنظیموں، اداروں اور جماعتوں میں ہر جگہ یہ بیماری ابھر آئی۔ سوچنے کے عمل اور اظہار کی آزادی پر قدغن لگ گئی۔ ڈاکٹر علوانی کے الفاظ میں ''ٹھہرے ہوئے اور ساکن افکار کا مجموعہ ذہنوں پر مسلط اور دماغوں پر حاوی ہو گیا۔ رسول اکرمؐ اپنے صحابہؓ کو پختہ رائے سازی اور اظہار رائے کے تمام وسائل کی تعلیم دینے میں نمونہ و ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ شوریٰ سے نہ غفلت برتتے تھے نہ ہی اس سے تجاوز کرتے تھے نہ بڑے معاملات میں نہ معمولی چیزوں میں۔ بدقسمتی سے بعد کے ادوار میں غور و فکر اور اظہار رائے کی روایت کمزور پڑ گئی۔ سرکش حکمرانوں کے جبر، علماء کی بے بسی اور امت کے عوام کی جہالت نے اندھی تقلید کو سب سے محفوظ طریقہ بنا کر مقبول عام کر دیا۔ اہل قلم اور ارباب تربیت نے اپنی ذمہ داری ادا کرنا ترک کر دیا۔ عقلیں کند اور ذہن کج ہو گئے، علمی محاسبہ و محاکمہ کے تمام تر آداب رخصت ہو گئے اور بات بات پر جنگ و جدال کی عادت ہو گئی۔ عوام بلکہ علماء بھی دوسروں کے وزن کو ڈھونے کا کام کرنے لگے۔

علمی محاسبہ و محاکمہ ایک ذہنی عمل کا نام ہے جس کی منہجی بنیادیں منزل تک رسائی کی ضامن ہوتی ہیں۔ اگر منہجی بنیادیں درست نہیں تو حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ ڈاکٹر عبدالحمید نجار کے الفاظ میں اسلام ہمیں ایک مخصوص فکری منہج عطا کرتا ہے جو باہر سے درآمد کیے گئے فکری مناہج سے مختلف ہے۔ باہر کے مناہج مثلاً یونان کے صوری منہج، تصوف کے اشراقی منہج یا مغرب کے مادی منہج سے فکر اسلامی میں بے شمار افتراق پیدا ہوئے۔ اسلامی منہج فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحمید نجار رقم طراز ہیں: وجود کائنات اور انسان کے انجام سے متعلق عقائد ہی طرز نظر یا طرز فکر کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس لیے بیشتر صورتوں میں کسی نظریہ پر اطمینان کے لحاظ سے قوموں کا فکر کے منہج میں اختلاف ہوتا ہے۔ اسلام ایسے عقیدہ کے ساتھ آیا جس کی بنیاد یہ تھی کہ اللہ محسوس مادی

دنیا کا براہ راست مدبر و منتظم ہے اور محسوس مادہ حقیر نہیں بلکہ اس لحاظ سے اسے عظمت حاصل ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ اس سے انہیں وہ منہج حاصل ہوا جس میں عقل محسوس حقائق کو حقیقت کی دریافت اور امور زندگی کے انتظام کا نقطہ آغاز بناتی ہے۔ (آزادی رائے کا کردار، ڈاکٹر عبدالحمید نجار، ص ۲۸)

بدقسمتی سے مغربی تہذیب کی یلغار نے مسلمانوں کے اعتقادی تصور کے بعض گوشوں کو مجروح کیا، اس کے نتیجہ میں ذہنی انتشار و بے سمتی پیدا ہوگئی اور فکری وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ نظریہ میں ہمہ گیری باقی نہ رہی۔ نگاہ کے دائرے سکڑ گئے۔ بات بات میں ٹکراؤ اور اختلاف کی شکلیں پیدا ہونے لگیں۔ حقیقت کی تلاش اور علوم کے دائرہ کو وسعت دینے کے بجائے ہمارے اچھے دماغ بھی منطقی بحثوں اور دوسروں کی گرفت کرنے اور بال کی کھال نکالنے میں مصروف ہوگئے۔ پھر آداب کلام بھی رخصت ہونے لگے۔ نقطہ نظر میں یکسانیت کے فقدان نے علمی وفنی کوششوں کو انتشار کا شکار بنادیا اور ان میں شیرازہ بندی نہ ہوسکی۔ اسلام کے اولین دور کے بعد جب خوارج کا فتنہ ابھرا اور حضرت علیؓ سے الگ ہوکر انہوں نے جو افتراق پیدا کیا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالحمید نجار لکھتے ہیں کہ خوارج نے فہم و تطبیق کے بہت سارے تقاضوں کو نظر انداز کر کے الفاظ کے ظاہر پر اکتفا کیا جس کے نتیجہ میں وہ مسلمانوں کی تکفیر تک جا پہنچے اور تکفیر کو خونی جنگوں اور ہلاکت خیز تہلکوں کی حد تک پہنچا دیا۔ (آزادی رائے کا کردار، ص ۳۲)

علمی محاسبہ و محاکمہ میں ضروری ہے کہ حق کی تلاش انسان کا اولین مقصد ہو اور اس کی خاطر حاصل شدہ مواد کو ہم آہنگ کرنے اور مشابہت و مماثلت کی بنیاد پر سب کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش سے دلالت کی کسوٹی پر پرکھنے کی جدوجہد کی جائے۔ بقول عبدالحمید نجار رابطہ بندی اور وحدت سازی کے اسی طرز پر عقل کی تشکیل کا سامان اسلامی عقیدہ میں موجود ہے۔ یہ عقیدۂ توحید مطلق پر استوار ہے یعنی کائنات میں جو کچھ ہے اس کا مبدا ایک ہے خواہ اس کی انواع کئی اور باہم مختلف ہوں۔ کائنات کا نظام، ترکیب و وحدت اور ظہور و خفا میں ایک قانون پر چلتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی شرعی انسانی یا کائناتی موضوع بحث ہو عقل کشاں کشاں ایک ہی غایت کی طرف بڑھتی جاتی ہے اور وہ غایت ہے انسانی زندگی میں توحید کے تقاضوں کی تکمیل۔ (آزادی رائے

کا کردار،ص ۲۳)

چنانچہ یہ منہجی خاصیت وحدت سازی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔سب کی منزل مقصود ایک ہوتی ہے اور کہیں بھی بحث ومجادلہ یا کاوش وتخلیق میں انسان کا نفس حائل نہیں ہوتا۔ اختلافات کی دیواریں گرجاتی ہیں۔جملہ علوم وفنون میں اس کنارے سے دوسرے کنارے تک ہم آہنگی ظہور میں آتی ہے۔البتہ تجزیہ کرنے اور غایت طے کرنے کے معیار میں اگر دہراپن ہے تو پھر بے سمتی شروع ہوجاتی ہے جوافتراق کا باعث بنتی ہے۔بدقسمتی سے مسلم دانش وراور علماء محاسبہ و محاکمہ کی وادی میں قدم رکھتے وقت توحید کی اقدار کو فراموش کرکے ماحول خاص طور پر مغرب سے درآمد کیے گئے،معیار واقدار کا اتباع کرتے ہیں اور باہم متصادم ہوجاتے ہیں۔

محاکمہ ومحاسبہ کے لیے ایسی تنقیدی بصیرت درکار ہوتی ہے جس کے تحت مقابل آرا جمع کرکے مختلف احتمالات میں تقابل کیا جائے پھر اس تقابل کی بنیاد پر ان کی جانچ کی جائے،بقول عبدالحمید نجار یہ تقابل،موازنہ اور جانچ پرکھ فکر کو حق کی رسائی کے لیے صحیح راستہ دکھانے کا ذریعہ بنتی ہے۔قرآن موازنہ سے بار بار کام لیتا ہے پھر حق کو باطل سے الگ کرتا ہے اور باطل کو دلیل و حجت کے ذریعہ شکست دیتا ہے:

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔کیا یہ ان ہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو۔(سورہ لقمان: ۲۱)

موازنہ وتنقید کا شعور قرآن حکیم کی آیتوں سے حاصل ہوتا ہے۔رائے کو ٹھکرانے کے بجائے رائے پر غور اور دلیل کی روشنی میں اسے رد کرنے کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اختلاف کے معاملہ میں تبع تابعین کے طرز عمل کی خوبی اور فکرو رائے کی درستی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جنہوں نے آزادی رائے پر قائم رہتے ہوئے احتیاط کا پہلو ہمیشہ مدنظر رکھا تاکہ امت کی وحدت قائم رہے اور جزوی مسائل کسی بڑی خلیج کی شکل اختیار نہ کریں۔ان کے پیش نظر قرآن کریم کی یہ آیت ہمیشہ رہتی تھی: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا الخ ''اور نہ ہوجانا تم اس عورت کی طرح جس نے توڑ ڈالا اپنے

کاتتے ہوئے سوت کو یعنی اسے مضبوط کرنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تا کہ ہو جائے ایک گروہ زیادہ فائدے میں دوسرے گروہ سے، حقیقت یہ ہے کہ آزمائش میں ڈالتا ہے تم کو اللہ اس (عہد و پیمان) سے اور کھول دے گا تم پر روز قیامت ان باتوں کی حقیقت جس میں تم اختلاف کرتے تھے''۔

اسلام نے مسلمانوں کے تہذیبی شعور کو بالیدہ بنانے اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو مستحکم اور ملی پیکر کو ایک سیسہ پلائی دیوار بنانے کی خاطر انسان کی نفسیات اور فطرت کے اس گوشہ پر خاص توجہ کی ہے۔ جس کے تحت وہ اپنی بات کو اوپر رکھنے اور دوسروں کی کاٹ کرنے کی طرف جھکتا ہے اور ایک معمولی اختلاف، ٹکراؤ اور جنگ و جدال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسلام نے انسان کو اپنی انفرادیت پر قائم رہنے کی اجازت دی ہے۔ اپنی ندرت فکر کے اظہار اور دوسروں سے الگ راہ بنانے والی رائے اختیار کرنے اور اپنا امتیاز قائم کرنے کی روش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن فرد کی انفرادیت اگر انانیت کے سانچے میں ڈھلنے لگے اور معاشرہ میں خوفناک خلیج و شگاف پیدا کرنے کی موجب ہو جائے تو پھر اس پر روک لگائی ہے۔ اس غرض سے واضح طور پر اخلاقی ضوابط اور آداب اختلاف کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جن کی روشنی میں ایک شخص دوسرے شخص سے اختلاف رائے کے باوجود اچھے رشتے استوار رکھ سکتا ہے اور اپنی زبان کو اختلافی امور میں دل خراشی، دل شکنی، سب و شتم اور جدال و ٹکراؤ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ عمر عبید حسنہ کے الفاظ میں ''ایمانی فراست، دوراندیشی اور فکر سلیم ہی ہمارے سارے تعلقات اور سرگرمیوں کے جواز و افادیت کی حقیقی ضمانت، باہمی اختلافات کے تصفیہ اور دلوں کی دوریاں ختم کرنے کی آخری پناہ گاہ ہے''۔ (اسلام میں اختلاف کے اصول و آداب)

خدا کی اس کائنات میں بے پناہ تنوع اور رنگارنگی ہے اسی طرح انسان کا وجود بھی بے حد متنوع ہے ایک انسان کی انگلی کی لکیریں تک دوسرے انسان کی لکیروں سے جدا ہیں۔ دو انسانوں کی آوازیں یکساں نہیں۔ اسی طرح انسان کی صلاحیت غور و فکر اور انداز فکر میں بھی بے حد تنوع ہے۔ خالق کائنات اس تنوع کو یک رنگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کا لحاظ و احترام کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ چنانچہ صحابہ کا یہ طرز عمل تھا کہ وہ دوسروں کی رائے کا احترام کرتے تھے اور انہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ ان کے بھائی کی رائے بھی درست ہو سکتی ہے جیسی ان کی

نظر میں اپنی رائے درست و برحق ہے۔ صحابہ نے اختلاف کو کس طرح سلجھایا اور کس طرح ضبط نفس کا مظاہرہ کیا وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ دوراول میں ہمارے اسلاف نے شائستگیِ اختلاف کے نرالے نمونے پیش کیے۔ ہمارے بزرگ اختلاف میں بھی اپنے ہم عصروں کی تعظیم وتوقیر ملحوظ رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ میں مرتد قیدی عورتوں کے بارے میں اختلاف رائے ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورخلافت میں حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ کے خلاف ان کو آزاد کردیا اوران کے مردوں کے حوالہ کردیا۔ اسی طرح مفتوحہ آراضی کی تقسیم کے بارے میں بھی اختلاف ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ تقسیم کے قائل تھے اور حضرت عمرؓ کی رائے وقف کی تھی مگر اس طرح کے اختلاف کے باوجود یہ بزرگ ایک جان دو قالب تھے اور ایک دوسرے کا غیر معمولی احترام کرتے تھے اور اختلاف کے بعد جب ان کو اپنی رائے کی کمزوری کا احساس ہوتا تو وہ بے تکلف اسے بدل دیتے۔

امام غزالی پانچویں صدی ہجری میں علماء کے زوال پر بے حد متفکر تھے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی، امام غزالی کی ممتاز تصنیف احیاء العلوم سراپا اسی نوحہ سے لبریز ہے۔ غرور جاہ، ریا وغیرہ عیوب سب سے زیادہ علماء میں تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ایک خاص باب غرور کے عنوان سے قائم کیا ہے، جس کے معنی ہیں دھوکہ میں پڑنا۔ اس باب میں ۴ گروہ شامل تھے۔ علماء، عباد، متصوفہ، امیر، ان کو شب و روز یہ تلاش رہتی ہے کہ فریق مخالف کو کیونکر ساکت کیا جائے۔ ان کی غلطیوں پر کس طرح مواخذہ کیا جائے اور ان کے اقوال میں کیونکر تناقض ثابت کیا جائے۔ امام غزالی یہاں تک لکھتے ہیں "یہ لوگ درندے ہیں اور لوگوں کو ستانا اور بے ہودہ پن کرنا ان کی فطرت میں داخل ہے"۔ (الغزالی، شبلی نعمانی، ص ۲۰۶، دارالمصنّفین، اعظم گڈھ)

اسی طرح متکلمین کے بارے میں غزالی لکھتے ہیں کہ "ان کا مشغلہ جرح وقدح، ردو اعتراض، نکتہ چینی، مخالف کی غلطیوں کی جستجو ہے، حالانکہ ان باتوں سے فریق مخالف کا تعصب اور بڑھتا ہے"۔ غزالی کے نزدیک مناظرہ ومجادلہ نے غیر معمولی اخلاقی زوال پیدا کیا ہے۔ اس سے تفاخر، حسد، شک، ضد، جاہ پرستی، حب مال، فضول گوئی اور قساوت قلب کے امراض انسان میں پیدا ہوتے ہیں۔ ماضی میں سلاطین وامراء اس آگ کو بھڑکانے کا ذریعہ تھے۔ اب ایسے مستقل

بالذات ادارے اور مسالک وجود میں آگئے ہیں جن کے اندر ایک جماعت اسی کام کے لیے پرورش پاتی ہے۔

قرآن حکیم میں ساری خلق خدا کو اللہ کا کنبہ قرار دیا گیا ہے اور کفار کے معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے۔ چہ جائے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو گالی دے۔ سورہ حجرات میں صاف صاف ارشاد ربانی ہے:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں طعن نہ کرو نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان کے بعد فسق کا نام بہت بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو بہت گمان سے پرہیز کرو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے''۔ (۱۱، ۱۲)

خدا کا شکر ہے کہ عصر رواں میں مسلمان علماء و اہل فکر میں اختلافات کی آگ بھڑکانے کی استعماری کوششیں ناکام ہوچکی ہیں اور مسلمانوں کے اندر انتشار و اختلاف کی فضا اب ختم ہوتی جارہی ہے۔ انیسویں صدی میں خاندان شاہ ولی اللہ نے اور اب بیسویں صدی میں متعدد اکابر نے اسلام کی اعتدال پسندی کے مزاج اور فروعات میں الجھنے کے بجائے دعوت اسلامی کو خلق خدا میں پیش کرنے کی طرف ملت کو مائل کیا ہے۔ اور اہل علم اور اہل قلم کی ایک بڑی تعداد مغرب کی نام نہاد روشن خیالی، تعقل، مادیت پرستی اور الحاد سے نبرد آزما ہونے کے لیے منظر عام پر آئی ہے۔ بہت سی تحریکیں، ادارے اور جماعتیں ملت کو مربوط کرنے اور وسعت نظر، فراخ دلی و بلندی خیالی پیدا کرنے میں مصروف ہوئیں، بحث و اختلاف کی صحت مند روایات قائم کی گئیں اور اس معاملہ میں دور اول کے اکابر کے طرز عمل کو اپنانے کا رجحان پیدا ہوا۔ تبادلہ خیالات (ڈائیلاگ) کا آغاز ہوا حتی کہ عیسائیوں، یہودیوں اور اہل ہنود سے ڈائیلاگ کا دنیا کے مختلف گوشوں میں آغاز ہوا۔ اب اختلاف نئی صورت میں ایک مرض کے بجائے انسانی ذہن کی صحت مندی کی علامت بن گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ شائستگی کلام اور تہذیب اختلاف کی روایات کے تابناک سرمایہ کی طرف جو اسے ماضی قدیم سے حاصل ہوا تھا ملت پھر متوجہ ہوئی ہے اور پھر

شادابی فکر و حسن رائے کی روایت کی بازیافت ہورہی ہے، تلخ کلامی اور لفظی جنگ و جدال کی جو عادت کچھ حلقوں میں پرورش پارہی تھی اس سے وہ لوگ خود متنفر ہورہے ہیں۔ علم و فہم، دلیل و حجت کی اہمیت محسوس کی جارہی ہے۔ اب ایسے اندوہ ناک مناظر سامنے نہیں آرہے ہیں جب مخالف کو زیر کرنے کے لیے دشمنان اسلام تک سے مدد لینے میں لوگ تکلف نہ محسوس کرتے تھے۔ ایسی فساد انگیزی اب خال خال نظر آتی ہے۔ اعتدال و جامعیت کی دل کشی ملت کے تقریباً تمام حلقوں میں محسوس کی جارہی ہے۔ اندھی تقلید اور عقل کو بالائے طاق رکھ کر اتباع سے لوگ کنارہ کش ہوکر اپنے شعور اور فہم سے کام لے رہے ہیں۔ فکری گروہ بندی، سیاسی تعصب اور تفرقہ اندازی سے لوگ بیزار ہیں۔ دوسروں کے عیوب ڈھونڈ ھنے اور اس کی تشہیر کو لوگ لغو مشغلہ سمجھنے لگے ہیں۔ لوگوں کو احساس ہورہا ہے کہ ان کے عقیدہ اور نظام فکر کا اصل حریف کون ہے۔ مغرب کی دہریت، مادہ پرستی اور صہیونیت کی اسلام کو داغدار کرنے کی سازشوں سے خدا کا شکر ہے کہ لوگ باخبر ہوتے جارہے ہیں اور اپنے بھائیوں کی معمولی معمولی باتوں پر ان سے جدال و تصادم سے حتی الامکان گریز کرنے میں اپنی خیر و فلاح سمجھتے ہیں۔ آداب بحث و محاکمہ کی حدود کا شعور عام ہورہا ہے۔ اس لیے کہ لوگ اپنے ماضی قدیم یعنی دور اول سے روشنی حاصل کررہے ہیں۔ یہ اسلام کی تاریخ میں ایک تابناک روایت کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہے۔ جو ضبط و تحمل اور آداب محاسبہ و محاکمہ کے معاملہ میں اپنے اسلاف قدیم کے طرز عمل کی طرف لوٹ رہی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کا شیرازہ وحدت مستحکم سے مستحکم ہوتا جارہا ہے۔

ایک جہانیان جہاں گشت ندوی

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

بیسویں صدی کے نصف آخر میں بہت سے علماء ملیں گے جن کی شمیم شہرت ہندوستان سے باہر نکل کر نہ صرف عالم اسلام بلکہ یورپ وامریکہ کے ملکوں تک پہنچ گئی، ان کو دنیا کی سیر کا خوب موقع ملا لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں ایسے علمائے دین کا نام شاذ و نادر نظر آئے گا۔ ان میں ایک نام ایک ایسے عالم دین کا ہے جس نے وسائل کے مفقود اور طاقت کے محدود ہونے کے باوجود دنیا کی خوب سیر کی اور وہ ایک جہاں گرد، جہاں گشت، جہاں پیما اور جہاں دیدہ عالم اور دانشور کی حیثیت سے جانا اور مانا گیا، اس نے یورپ اور امریکہ کی خاک چھانی لیکن اس نے اپنا آخری پڑاؤ آستانۂ حرم پر ڈالا، اس شخصیت کا نام ہے ڈاکٹر زین العابدین عثمانی ندوی۔

اگر کوئی عالم اور ادیب جریدۂ عالم پر نقوش قلم چھوڑ کر دنیا سے جاتا ہے تو اس کے بارے میں مواد جمع کرنا اور قلم اٹھانا اور تحقیقی کام کرنا آسان ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص جریدۂ عالم کے بجائے خریطۂ عالم پر نقوش قلم نہیں بلکہ نقوش قدم چھوڑ کر جاتا ہے تو اس کے بارے میں معلومات کا ذریعہ اس کا حلقۂ احباب ہوتا ہے یا حلقۂ اقربا، پھر اگر ان معلومات کو محفوظ نہ رکھا جائے تو وہ ضائع ہوجاتی ہیں۔ ڈاکٹر زین العابدین عثمانی ندوی نے کتابیں نہیں لکھیں لیکن وہ زندگی کی کتاب معتبر تھے اور لوگوں کے درمیان محبوب وموقر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے وہ قریبی اعزہ جو امریکہ میں جا کر آباد ہوئے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بعض قیمتی معلومات جمع کرلی ہیں، ڈاکٹر صاحب نے جس زمانے میں یورپ وامریکہ کا سفر کیا، اس زمانہ میں ان ملکوں کا سفر آسان نہ تھا، وہ بھی ایک دینی مدرسہ کے فارغ طالب علم کے لیے۔ انہوں نے اپنی

ڈین اسکول آف عرب اسٹڈیز، انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی، حیدرآباد۔

زندگی تصنیف و تالیف کے خلوت کدہ میں بیٹھنے کے بجائے کتاب زندگی کے مطالعہ میں بسر کی تھی اور اپنے ماحول میں اخلاق و کردار کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے دنیا کا سفر صرف عزم و ہمت کے سہارے پر کیا تھا۔

مولانا ڈاکٹر شاہ زین العابدین عثمانی ندوی کی پیدائش بہار میں گیا ضلع کے ایک گاؤں پیر بیگھا میں ہوئی تھی، بیسویں صدی کے آغاز کو صرف پانچ دن باقی رہ گئے تھے گویا ۲۵/دسمبر ۱۹۰۰ تاریخ پیدائش تھی، ہجری سن ۱۳۱۴ تھا۔

بہار کے عثمانی خاندان کا نسبی تعلق حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء سے ہے جو سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے۔ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء کے جد امجد دو تین پشت کے اوپر محمود غزنوی کی فوج میں غزنی سے ہندوستان آئے تھے اور ان کو پانی پت کے جوار واطراف کا قاضی اور دینی امور کا منتظم بنایا گیا تھا۔ جلال الدین کبیر الاولیاء کے احفاد میں ایک بزرگ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی تصوف کے میدان میں شہرت سن کر بہار شریف آئے تھے لیکن اس وقت حضرت منیری کا انتقال ہو چکا تھا تاہم پانی پت کے بزرگوں کا خاندان بہار پہنچا اور یہاں سکونت پذیر ہوا۔ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی کے پیر و مرشد حضرت کبیر الدین ترک پانی پتی تھے جن کی قبر پانی پت میں موجود ہے اور جو حضرت شاہ علی قلندر پانی پتی کے معاصر تھے۔ شمس الدین ترک پانی پتی کے پیر و مرشد مشہور چشتی بزرگ حضرت مخدوم صابر کلیری تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کو حضرت جلال الدین کبیر الاولیا سے بہت فروغ حاصل ہوا اور ان کے متعدد خلفاء ہوئے جن میں سب سے اہم اور زیادہ مشہور شیخ عبدالحق ردولوی تھے، پانی پت کا یہ عثمانی خاندان بہار شریف آنے کے بعد دوبارہ واپس پانی پت نہیں گیا۔ اس وقت بہار کے کئی قصبوں میں عثمانی خاندان آباد ہیں۔ جن کا نسبی تعلق پانی پت کے عثمانی خاندان سے ہے اور جنہوں نے اپنے نسب نامہ کی لعل و گوہر کی طرح حفاظت کی۔ (مقدمہ دیوان باقر و حیات و خدمات شاہ محمد عثمانی مع نسب نامہ)

ڈاکٹر زین العابدین عثمانی اسی دودمان عالی مقام کے ایک معزز فرد تھے جن کی نشو و نما شہر گیا اور پٹنہ میں ہوئی اور اس کے بعد یہ تعلیم کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ چلے گئے۔ ڈاکٹر زین العابدین عثمانی کے دادا ڈپٹی حسین علی مشہور حکیم اور شاعر تھے اور ان کا تخلص اشکی تھا اور وہ بنگال کے مشہور

شاعرفریاد کے استاد تھے، ڈپٹی حسین علی کی طب میں مشہور تصنیف مجربات حسینی ہے، ڈپٹی حسین علی کی اولاد میں ایک محی الدین محمد تقی تھے۔ جنھوں نے فرنگی محل لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی تھی اور لکھنؤ ہی میں طب کی تعلیم بھی مکمل کی تھی، ان کو بحیثیت حکیم بہت شہرت اور نیک نامی حاصل ہوئی، حکیم محمد تقی کے چچا باقر گیاوی تھے جو فارسی کے بھی شاعر تھے اور غالبؔ کے شاگردوں میں ان کا نام آتا ہے، ان کا دیوان ''دیوان باقر'' کے نام سے ان کے صاحب زادے عطا حسین نے حیدرآباد سے شائع کیا تھا، اس کے طویل مقدمہ میں انہوں نے ہندوستان کے عثمانی خاندان کے حالات تفصیل کے ساتھ درج کیے ہیں، عطا حسین صاحب نظام حیدرآباد کے زمانے میں معتمد تعمیرات کے عہدہ پر فائز تھے۔

فخر خاندان ڈاکٹر زین العابدین عثمانی کے والدین کا سایہ بچپن میں سر سے اٹھ چکا تھا، ان کی پرورش ان کی بڑی بہن بی بی ام سلمی نے کی تھی، جو راقم سطور کی دادی تھیں، بی بی ام سلمی ان کو لے کر قصبہ نیورہ آگئیں جہاں ان کے دوسرے قریبی اعزہ تھے، ڈاکٹر صاحب کے ایک خالو جسٹس شرف الدین تھے، جو نیورہ کے رہنے والے تھے، یہ قصبہ پٹنہ اور شہرآرہ کے درمیان واقع ہے، جسٹس سید شرف الدین اور ان کے خاندان کے لوگوں میں شمس العلماء سید حافظ محبّ الحق بھی تھے، جنھوں نے ندوہ کی تحریک وتاسیس میں حصہ لیا تھا، اس وجہ سے ڈاکٹر زین العابدین صاحب کو تعلیم کے لیے ندوہ بھیجا گیا تھا، ندوہ میں علامہ سید سلیمان ندوی ڈاکٹر صاحب سے صرف ایک درجہ آگے تھے، ان کے معاصرین میں بہار کے مولانا احمد اللہ ندوی بھی ہیں جنھوں نے شعرائے بہار کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ وہ دارالترجمہ حیدرآباد میں ملازم تھے اور پاکستان جانے سے پہلے حیدرآباد میں مقیم تھے۔

ڈاکٹر زین العابدین عثمانی نے چندسال میں ندوہ کی تعلیم مکمل کی، یہ وہ عہد تھا جس میں ہندوستان میں علامہ شبلی کا طوطی بول رہا تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کے سحر حلال کی شہرت ہر تعلیم یافتہ خاندان تک پہنچ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے تعلقات ندوہ میں اپنے ہم وطن طالب علم مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بہت گہرے تھے۔ سید صاحب کہا کرتے تھے کہ میں نے زین العابدین عثمانی جیسا عزم و ہمت کا طالب علم نہیں دیکھا جس نے وسائل سے محرومی کے

باوجود یہ اعلان کر رکھا تھا کہ اسے یورپ وامریکہ حصول تعلیم کے لیے جانا ہے، اس ارادہ کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے دادا ڈپٹی حسین علی کے داماد چیف جسٹس شرف الدین تھے جنہوں نے اپنے اثرات سے کام لے کر علی امام، حسین امام اور مسٹر عزیز کو اعلا تعلیم کے لیے باہر بھیجا تھا اور یہ لوگ واپس آکر بیرسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے، غالباً یہی چیز ڈاکٹر صاحب کے ذوق وشوق کے لیے سرچشمہ بنی اور یہ آرزو ان کے لیے شمع کے مانند فروزاں رہی ہوگی، وہ ندوہ سے نکلے تو یورپ اور امریکہ کے لیے روانہ ہوئے، انہوں نے اپنی کشتی بحر زخار میں ڈال دی۔

ڈاکٹر صاحب ندوہ سے ۱۹۱۷ء میں فارغ ہوئے۔ اسی زمانے میں حیدرآباد سے ان کو حسن خدمت کا ایوارڈ بھی ملا، حیدرآباد میں ان کے رشتہ کے چچا عطا حسین نظام کے دور میں معتمد تعمیرات تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے لگاتار ترقی کی منزلیں طے کیں، ''ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی'' والا معاملہ تھا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ اٹلی گئے رومن کیتھولزم کے موضوع پر انہوں نے علمی اور تحقیقی کام شروع کیا، اس کی وجہ سے رومن کے علمی حلقوں میں ان کا تعارف ہوگیا اور کئی انٹرنیشنل کانفرنسوں میں انہوں نے مقالے پیش کیے۔ ۱۹۱۹ء میں عیسائی مذہب کے سب سے بڑے رہنما پوپ سے انہوں نے ملاقات کی، انہوں نے پوپ سے انسانی زندگی کے لیے مذہب کی ضرورت پر تبادلۂ خیال کیا۔ پوپ نے انہیں بطور تحفہ ایک کتاب Antique Book پیش کی جو آج بھی خاندان میں یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ ہندوستان کے علمی حلقوں میں بھی ان کا تعارف ہوا اور علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کا ۱۹۲۰ء میں ان کو اعزازی ممبر بنایا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں پیرس کی سوسائٹی آف فلاسفی کا ان کو ممبر بنایا گیا۔ پھر ۱۹۲۱ء میں اسکاٹ لینڈ میں Glasgow University میں ریلیجن اینڈ ہیومینیٹی پر لکچر دینے کے لیے ان کو بلایا گیا، پھر اسی سال ان کو انگلینڈ کے ادارہ Inter National Dephilologie کا اعزازی ممبر نامزد کیا گیا۔

ہندوستان کے اندر کلکتہ، لاہور، لکھنؤ کے کئی اداروں میں ان کے توسیعی خطبات ہوئے، اسکاٹ لینڈ کے Berlitz School میں ۱۹۲۳ء میں پندرہ دن کے اندر عربی اور اردو سکھانے کا انہوں نے مظاہرہ کیا، ۱۹۲۲ء میں انہیں امریکہ کی National Ceranic Society کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء ہی میں نیویارک کے Board of Foreign Mission کا انہیں ٹرسٹی منتخب کیا

گیا۔ ۱۹۱۸ء میں Indian National Congress کے اعزازی ممبر کی حیثیت سے ان کے نام کا انتخاب ہوا، ۱۹۲۲ میں نیویارک میں انہوں نے المعین لاج قائم کیا، پھر اسی نام سے ایک لاج انہوں نے ۱۹۲۳ء میں مشی گن سٹی میں قائم کیا، ان کی سماجی اور علمی سرگرمیوں کو دیکھ کر Scientific Institute of New York کا انہیں ممبر منتخب کیا گیا، امریکہ کے مشی گن سٹی میں انہوں نے Ford School of Technology سے انہوں نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی، وہ علوم جدیدہ سے اور جدید تعلیم کے طریقۂ کار سے واقف تھے، انہوں نے مختلف میدانوں میں امریکہ میں اپنی سماجی اور علمی سرگرمیوں کا نقش قائم کیا، امریکہ کے شہر Detriot میں ۱۹۲۵ء میں انہوں نے امپورٹ ایکسپورٹ کی ایجنسی قائم کی تھی، پھر اسی شہر میں انہوں نے American Asiatic Association کی بنیاد رکھی تھی۔

ہندوستان سے امریکہ روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے لندن میں انگریزی زبان و ادب میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ایک عرصہ تک قیام کیا تھا، تاکہ یورپ و امریکہ میں ان کی تعلیمی و سماجی سرگرمیوں کے لیے کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے۔ ایک عالم دین کی حیثیت سے امریکہ میں انہوں نے اپنی شناخت بنائی اور مشی گن سٹی میں یونیورسل اسلامک سوسائٹی میں امام اور نائب صدر کی حیثیت سے دینی سرگرمیاں انجام دیتے رہے، وہ انگلینڈ میں بھی رہے اور امریکہ میں بھی اور دونوں جگہ انہوں نے عیسائی مشنریوں سے رابطہ قائم کیا، اسلام کے تعارف کی کوشش کی۔ ان کا وجود زبان حال سے عیسائیت کے صحرا میں اذان اور کلیسا میں اسلام کے اعلان کے مرادف تھا۔ جرمنی میں بھی ایک عرصہ تک ان کا قیام رہا اور وہاں بھی وہ دین کی تبلیغ سے غافل نہیں رہے، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ زبان و ادب کا کوئی طالب علم بھی جب یورپ و امریکہ کے لیے رخت سفر باندھتا ہے تو اس کا مقصود زبان و ادب اور زیادہ سے زیادہ سماجی علوم کی تحصیل ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے دیار مغرب میں صنعتی علوم کی تحصیل بھی کی اور ادبیات کے بجائے تعلیم کے لیے صنعت و ٹکنالوجی کا انتخاب کیا۔ اور جب وہ اپنے وطن ہندوستان واپس آئے تو موٹر بنانے کا کارخانہ قائم کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کے لیے انہوں نے اپنے آبائی وطن میں جائداد فروخت کرنے کا ارادہ کیا جس کے لیے خاندان کے لوگ بالکل تیار نہیں

ہوئے اوراس ارادہ کی تکمیل میں لوگوں نے رکاوٹ ڈالی اوران کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

ابتداء سے ان کو ہومیو پیتھک علاج ومعالجہ کا شوق تھا، اس میں انہوں نے اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی تھی۔ ایک ڈبے میں ہومیو پیتھک دوائیں ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتیں اور سفر و حضر میں وہ لوگوں کا مفت علاج کیا کرتے، امریکہ میں صنعت وٹکنالوجی کی تعلیم کے علاوہ انہوں نے چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت کے فن میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا تھا، ہندوستان میں ان کے تعلقات بہت سے علماء اور دانش وروں سے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے اور یہ سب لوگ ڈاکٹر زین العابدین صاحب کی ذہانت وفراست اور قدیم وجدید علوم سے واقفیت اوران کی ہنرمندی اور طباعی سے واقف تھے، ڈاکٹر صاحب جب ہندوستان واپس آئے تھے اور موٹر کے کارخانے قائم کرنے کا ان کا منصوبہ روبہ عمل نہ ہو پایا تھا، اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے انہیں جامعہ ملیہ کی خدمت کے لیے بلالیا، جامعہ ملیہ کا ادارہ اس وقت ناسازگاری اور اقتصادی بحران کا شکار تھا، ادارہ کو چلانا مشکل ہورہا تھا، حکیم اجمل خان کی تمام کوششیں اس بات پر مرکوز تھیں کہ جامعہ ملیہ کے چراغ کو تیل اور روغن ملتا رہے اور علم وآگہی کی یہ شمع جو مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں روشن کی گئی تھی ضوفشاں رہے، ڈاکٹر زین العابدین صاحب کو جامعہ کی خدمت کے لیے اور مالیہ کی فراہمی کے لیے کلکتہ بھیجا گیا اور وہ اس مشن میں پورے طور پر کامیاب رہے، ڈاکٹر زین العابدین صاحب اگر مستقل طور پر ہندوستان میں قیام کرتے تو ڈاکٹر ذاکر حسین، حکیم اجمل خان اور شفیق الرحمان قدوائی سے گہرے مراسم اور تعلقات کی وجہ سے وہ کسی باوقار تعلیمی عہدہ پر فائز ہوتے لیکن تقدیر کا فیصلہ یہ تھا کہ انہیں جوار حرم میں زندگی گزارنے اور اہل حرم کی خدمت کی سعادت حاصل ہو، مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے پاس جو جامعہ ملیہ کے ذمہ دار اعلیٰ تھے، یہ خط پہنچا کہ مدرسہ صولتیہ کو ایک ایسے استاذ کی ضرورت ہے جو نہ صرف عربی زبان وادب سے واقف ہو اور عالم دین ہو بلکہ اسی کے ساتھ بچوں کی تعلیم کے فن سے بھی پورے طور پر آگاہ ہو، اس وقت حال یہ تھا کہ جو لوگ عالم دین تھے اور عربی زبان جانتے تھے، وہ جدید فن تعلیم وتربیت سے واقف نہ تھے اور جو لوگ جدید تعلیم و تربیت کا فن جانتے تھے وہ نہ تو عالم دین تھے اور نہ عربی زبان وادب سے واقف، اس وسیع اور

مردم خیز ملک میں اس قسم کی علمی جامعیت تنہا ڈاکٹر زین العابدین صاحب کو حاصل تھی۔ ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب نے جب ان کے سامنے مدرسہ صولتیہ کی اس طلب کا تذکرہ کیا تو انہوں نے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ میں تدریسی منصب کو خوش دلی سے قبول کرلیا۔

ڈاکٹر زین العابدین صاحب جہاں گردی اور جہاں پیمائی کے بعد اس مقدس سرزمین میں پہنچ گئے جو ہندوستان کی جانب سے نماز کا قبلہ اور مسلمانان عالم کے لیے مرکز محبت ہے، مدرسہ صولتیہ میں تدریس کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہومیو پیتھک علاج و معالجہ کا سلسلہ جاری رکھا، بحیثیت معالج ان کی شہرت شمیم گل کی طرح چمن حجاز میں پھیل گئی، اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کے بنائے ہوئے اسباب کو سمجھنا پہلے سے مشکل ہوتا ہے، سعودی عرب میں ایلو پیتھک طریقہ علاج کے سوا کسی طریقہ علاج کی قانونی طور پر اجازت نہیں ہے، شاہی خاندان کے ایک فرد کا انہوں نے علاج کیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں دست شفاء سے نوازا تھا، ہومیو پیتھک علاج سے شاہی خاندان کا وہ فرد ٹھیک ہوگیا، چنانچہ پورے ملک میں تنہا ان کو ہومیو پیتھک علاج کی اجازت حاصل ہوگئی، پھر مدرسہ صولتیہ سے الگ ہوکر انہوں نے اسی طریقہ علاج کو اپنے معاش کا ذریعہ بنایا، اللہ تعالیٰ نے اس پیشہ میں بڑی برکت عطا کی اور وہ اس سرزمین میں جہاں لوگ سر کے بل آنا چاہتے ہیں، صاحب زمین اور صاحب جائداد بن گئے، ہندوستان سے آنے والے لوگ خاص طور پر ان سے ملنے کے لیے آتے اور ان کی حوصلہ مندی، دریا دلی اور فیاضی سے متاثر ہوکر جاتے، ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب جب ہندوستان میں نائب صدر جمہوریہ بنے تو عمرہ کے لیے سعودی عرب آئے اور خدم وحشم اور سرکاری اعزاز کے ساتھ ڈاکٹر زین العابدین صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے گھر پر آئے کیوں کہ وہ اس وقت فریش اور بیمار تھے۔

مکہ معظّمہ میں قیام کے زمانہ میں جب بھی ڈاکٹر زین العابدین صاحب ہندوستان آئے تو ندوہ بھی آئے اور دارالمصنّفین بھی گئے، اس وقت دارالمصنّفین میں شاہ معین الدین احمد ندوی معارف کے اڈیٹر اور ادارہ کے ذمہ دار تھے، ندوہ سے اور فضلائے ندوہ سے ان کا بہت زیادہ قلبی تعلق تھا، ایسا تعلق جو کسی فرد کو اپنے خاندان سے ہوتا ہے، علامہ سید سلیمان ندوی ندوہ میں ان سے ایک سال سینئر تھے اور وہ سید صاحب کو ندوہ کا درشہوار سمجھتے تھے، ہم وطن ہونے کی

وجہ سے ان سے اور بھی خصوصی تعلق تھا۔ جب انہوں نے مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے ہاتھ پر سید صاحب کے بیعت ہونے کی خبر سنی تو انہیں اس کا بڑا ملال ہوا،لیکن اس موضوع پر سب سے مناسب تبصرہ وہ ہے جو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے سید صاحب کے تذکرہ میں پرانے چراغ میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا کہ سید صاحب علم و تحقیق کے چشموں سے سیراب ہو کر اور علوم دینیہ اور تاریخ و ادبیات کے سمندر میں بار بار غوطے لگانے کے بعد اپنی روح کی پیاس اور ''قلب کی کسی اور چیز کی تلاش'' محسوس کرنے لگے تھے اور اپنے محبوب دوست اور نامور معاصر علامہ اقبال کے الفاظ میں خلوتوں میں (زبان حال سے) زیر لب اس طرح گویا ہوتے تھے کہ:

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بو لہب

شاید علماء معاصرین کم از کم ہندوستان کے فضلائے مدارس میں کسی ضمیر میں عقل و عشق، قدیم و جدید، مشرق و مغرب اور دین و ادب یا دین و فلسفہ کا یہ معرکہ اس طرح برپا اور تازہ نہ ہوا ہوگا جس طرح ندوہ کے اس فاضل، سیرت النبیؐ کے اس مصنف، میدان سیاست اور بزم ادب کے اس محرم راز اور یورپ کے اس سیاح کے ضمیر میں ہوا تھا، انہوں نے اس نخیل علم کی آبیاری بھی کی تھی، اس کی گھنی چھاؤں میں برسوں آرام بھی کیا تھا، اس کی تاریخ بھی لکھی تھی، اس کی زندگی اور موت کا فلسفہ بھی بیان کیا تھا لیکن ان کے قلب سلیم اور روح بیتاب کی شہادت تھی (اگرچہ ان کے بہت سے معتقدین، تلامذہ اس کے ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ سید صاحب میں کوئی کمی اور تشنگی ہے) کہ وہ اس کے تازہ اور شاداب رطب سے فیض یاب نہیں ہوئے تھے، ان کی کتابوں نے بالخصوص

خطبات مدراس ، سیرت النبیؐ کے مضامین اور سیرت عائشہؓ کے صفحات نے ہزاروں کو حلاوت ایمانی سے لذت آشنا کیا تھا لیکن ان کی ہمت عالی اور طائر بلند پرواز خود اس دولت بیدار کا طالب تھا، جس کو حدیث میں احسان اور قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور جس طرح ان کو علم وادب کی وادی کو کامیابی اور فتح مندی کے ساتھ طے کرنے کے لیے علامہ شبلی جیسا خضر طریق ملا تھا، احسان وتزکیہ کی وادی کے لیے بھی ایک خضر راہ اور ایک مرد حق آگاہ کی تلاش تھی...... یہ خضر راہ ان کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی شکل میں مل گیا''۔ (پرانے چراغ، حصہ اول، ص ۳۲-۳۴)

ڈاکٹر زین العابدین عثمانی ندوی کا انتقال مکہ مکرمہ میں ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۸۸ھ میں ہوا، عیسوی تقویم کے لحاظ سے ان کی عمر ۷۲ سال اور ہجری تقویم کے لحاظ سے ان کی عمر ۷۴ سال تھی۔ بلاشبہ ان کی حیثیت فخر خاندان کی تھی، جنہوں نے یورپ وامریکہ میں اسلام کی تبلیغ کی اور عیسائیوں کو مسلمان بنایا، ہمارے خاندان میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ اور قاضی احمد حسین اور ڈاکٹر ندوی وہ ماڈل ہیں جنہیں اقبال کی زبان میں وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر زین العابدین صاحب نہ ادیب تھے، نہ محقق، نہ مورخ، ادیب کے بجائے وہ ادب آشنا اور تہذیب شناس تھے، محقق کے بجائے حقیقت پسند تھے اور حق آگاہ تھے، تاریخ نویسی کے بجائے تاریخ سازی کی انہوں نے کوشش کی تھی، ایک انگریز مفکر بنجامن فرینکلن نے کہا تھا کہ انسان کو دو میں سے کوئی ایک کام ضرور کرنا چاہیے، یا تو وہ ایسی کتابیں لکھ ڈالے جو اس کے مرنے کے بعد بھی پڑھی جائیں یا ایسے کام کر ڈالے کہ لوگ اس کے بارے میں باتیں لکھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے کام کیے جو انہیں محبوب خلائق بناتے ہیں، ہندوستان سے جو لوگ حج اور عمرہ کے لیے جاتے اور ڈاکٹر صاحب سے ملتے وہ ان کے دسترخوان اور ان کے دست کرم کے فیض سے محروم نہ رہتے۔

اخبار علمیہ

''عصر حاضر میں مسلم ورثہ کی تلاش'' کے عنوان سے مسلمان سائنس دانوں کے ذریعہ تیار کی گئی ساتویں صدی سے اب تک کی سینکڑوں ایجادات کی نمایش کا اہتمام لندن سائنس میوزیم میں کیا گیا، یہ جون ۲۰۱۰ء تک جاری رہے گی، اب تک ۸۰ / ہزار افراد اس نمایش میں آچکے ہیں جس سے طب، انجینئرنگ، فلکیات، جغرافیہ اور دیگر سائنسی شعبوں میں مسلم سائنس دانوں کی گراں قدر خدمات کا اندازہ ہوتا ہے، نمایشی اشیا کو گھر، اسپتال، بازار وغیرہ کے تقریباً سات زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے، اب یورپ، امریکہ، مشرقی ایشیا اور افریقہ سمیت دنیا کے ۱۲ / ملکوں نے بھی اپنے یہاں اس کے اہتمام کا عزم ظاہر کیا ہے۔

چلی میں اس وقت کل تین ہزار مسلمان آباد ہیں جن کی اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے، قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود وہاں کے مسلمان کسی قسم کے امتیاز و تعصب کے شکار نہیں، ۱۹۷۰ء کی دہائی تک وہاں نہ مسلمانوں کا کوئی مرکز تھا اور نہ ہی دینی امور میں ان کی رہنمائی کا کوئی نظم۔ ۱۹۹۰ء میں پہلی بار ''السلام مسجد'' تعمیر ہوئی جس کا افتتاح شاہ ملیشیا نے کیا، پھر ۱۹۹۵ء میں ایک اور مسجد اور ۱۹۹۸ء میں شہر اقیوقی میں بھی ایک مسجد بنائی گئی، ۲۰۰۱ء میں ایک ادارہ ''اسلامک چلین کوآپریشن آف ٹیموکو'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے جس کا مقصد مذہب اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے اخلاقی اقدار کو فروغ دینا ہے۔

انقلاب ایران کے بعد ۳۱ / برسوں میں ایران نے تعلیمی میدان میں حوصلہ افزا ترقی کی ہے، اس کا اندازہ درج ذیل جائزہ سے ہوتا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں انسانی ترقی کی شرح میں ایران ۱۰۱ویں نمبر پر تھا، ۲۰۰۹ء میں ۸۸ویں پر آگیا، ۷۹ء میں شرح خواندگی ۳۶٫۵ فیصد تھی جو ۲۰۰۹ء میں ۸۲٫۳ فیصد ہوگی، اسکولوں کی تعداد ۵۳۸۸۵ سے ۱۴۹۶۰۵، اعلیٰ تعلیمی مراکز ۲۲۳۰ سے ۲۱۵۸۰ اور یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی مراکز میں شعبہ جاتی ممبروں کی تعداد ۵۵۸۰ سے بڑھ کر ۵۸۰۰۰ ہوگئی، ۷۹ء میں ۵۶۸۰۰ طلبہ نے داخلہ لیا، ۲۰۰۹ء میں یہ تعداد

۱۳۰۷۰۶۰ ہوگئی، ۷۹ء میں انسٹی ٹیوٹ فار سائنٹفک انفارمیشن میں ایران سائنس دانوں کے ۳۵ مقالے شائع ہوئے، اس کے بعد یہ تعداد ۱۳۵۰۰ ہوگئی، ۷۹ء میں ثبت شدہ ایجادات کی تعداد ۲۰۰۹ء میں ۸۴۱ سے بڑھ کر ۲۰۴۰۰۰۰ ہوگئی، فزکس میں ایران ۴۶ویں اور کیمسٹری میں ۳۲ویں مقام پر ہے۔

دبئی سلیکان نخلستان میں احمد بن سعید المختوم کے ہاتھوں انٹرنیشنل انڈین ہائی اسکول کی بنیاد رکھی گئی ہے، جس کا نصاب سی بی ایس ای کا ہوگا، اپریل ۲۰۱۱ء سے اس میں تعلیم شروع ہوجائے گی، ۳/ہزار طلبہ اس میں زیرتعلیم ہوں گے، کم خرچ میں معیاری تعلیم فراہم کرنے کا یہ منصوبہ وہاں مقیم ہندوستانیوں کے لیے نعمت سے کم نہیں۔

جرمنی کے ماہرین نے شمسی توانائی سے چلنے والی سہ منزلہ کشتی تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کا طول ۳۰ میٹر اور عرض ۱۵ میٹر ہوگا، یہ چار ماہ بیس دن میں دنیا کے پورے خطۂ آب کا چکر لگا سکتی ہے، اس کی اوپری سطح پر شمسی توانائی کو برقی توانائی میں تبدیل کرنے والی مشینیں ایک خاص ترتیب کے ساتھ نصب کی گئی ہیں، کنیرم شپ یارڈ میں تیار کی جانے والی اس کشتی پر اخراجات کا تخمینہ ایک کرور یورو لگایا گیا ہے، رپورٹ کے مطابق بحر اوقیانوس سے عبور کرنے کے بعد یہ پناما نہر سے ہوتی ہوئی اور بحر الکاہل، بحر ہند کو عبور کرتے ہوئے پیرس ہانگ کانگ اور نیویارک جائے گی، اس میں ۱۰۳ میگاواٹ بجلی فراہم کرنے والی بیٹریاں بھی لگائی گئی ہیں، اس میں نصب شمسی سیل روزانہ ایک ہزار واٹ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس سے شمسی شعاعوں کے عدم حصول کے باوجود ۱۸/کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے یہ کشتی اپنا سفر جاری رکھ سکے گی۔

اطلاع کے مطابق متعدد زبانیں صفحۂ وجود سے مٹتی جارہی ہیں، جیوگریفک سوسائٹی اینڈ لیونگسٹک انسٹی ٹیوٹ کے مطابق ہر پندرہ دن میں ایک زبان کی موت ہورہی ہے، اس طرح ۲۱۰۰ء تک سات ہزار زبانوں کے ختم ہوجانے کا اندیشہ بڑھ گیا ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سی زبانوں کے ریکارڈ تک نہیں ہیں، ایک زبان کی موت سے صرف زبان ہی اپنا وجود نہیں کھوتی بلکہ اس زبان کا ذخیرۂ معلومات، اس کی تاریخ وتہذیب سے وابستہ تقریباً تمام چیزیں

معدوم ہو جاتی ہیں۔ یہ موجودہ ترقی یافتہ اور مہذب دنیا کے سامنے ایک بڑا چیلنج ہے۔

امریکہ کی یونیورسٹی آف اریزونا سے وابستہ ایک محقق پروفیسر ریشلیسن اوران کی ٹیم نے ایک تحقیق یہ پیش کی ہے کہ انسان نے ۳۶ لاکھ برس پہلے زمین پر چلنا سیکھ لیا تھا، اس سے قبل انسان درختوں پر اپنا بیشتر وقت گزارتا تھا، ان کے بیان کے مطابق انہوں نے ۳۶/ لاکھ برس قبل ایک آتش فشاں کی راکھ میں ایک جاندار کے نقش کف پا سے اس کا اندازہ کیا ہے، ریشلین اوران کے معاونوں نے اس معما کوحل کرنے کے لیے ریت کا راستہ بنایا اوراس پر چلنے والے افراد کی فلم تیار کی، چلنے والوں کو پہلے عام طریقہ سے چلنے کی ہدایت کی گئی اس کے بعد گوریلوں کی طرح انہیں ریت پر چلایا گیا تو انہوں نے ایڑی اور پیر کے انگوٹھے کے نشانوں کی نسبتاً گہرائی کا تجزیہ کرنے کے بعد پایا کہ سیدھے چلنے والے شخص کے قدم کی گہرائی کے نشان تقریباً یکساں ہیں، اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جب انسان کی جسمانی ہیئت درختوں پر رہنے کے لائق تھی، اس وقت بھی انسان پیروں پر چلنا سیکھ چکا تھا۔

گلوب انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کے ایک جائزہ میں عام امریکی سے سوال کیا گیا کہ وہ اسلام کے متعلق کیا جانتا ہے، جواب میں ۶۳ فیصد امریکیوں کا کہنا تھا کہ انہیں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کچھ معلوم نہیں یا ان کے پاس ناکافی معلومات ہیں، ۴۸ فیصد امریکیوں کا کہنا تھا کہ ان کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی ربط نہیں البتہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ہمارے معاشرہ میں ایک خاص تصور ہے جس پر انہیں یقین ہے کہ وہ غلط نہیں ہے۔

برطانوی محققین کی تحقیق کے مطابق مچھلی خوری سے دماغ کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے انہوں نے ۷۰ سے ۷۹ سال کی عمر والوں کے تین ہزار سے زیادہ افراد کی دماغی صلاحیت کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ مچھلی خوروں کی دماغی قوت ان سے زیادہ ہے جو مچھلی کا استعمال نہیں کرتے۔

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

حدیقہ منزل،
نیوسرسید نگر، علی گڑھ
۱۷/فروری ۲۰۱۰ء

محترم عالی مولانا عمیرالصدیق ندوی صاحب زید مجدہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف کا جنوری ۲۰۱۰ء کا شمارہ ملا، اس میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی پر ڈاکٹر سید اختیار جعفری کا مقالہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ فاضل مقالہ نگار نے مولانا اکبرآبادی کے حالات زندگی پر اور ان کی تصانیف کے تعارف پر ایک جامع مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ میں اس کے لیے ان کو مبارک باد دیتا ہوں اس سلسلہ میں چند باتیں لکھنا چاہتا ہوں امید ہے کہ فاضل مقالہ نگار ان پر غور فرمائیں گے۔

خاندانی حالات کے سلسلہ میں مولانا اکبرآبادی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی میرے ماموں زاد بھائی تھے اور مرکزی وزیر حافظ ابراہیم میرے خالہ زاد بھائی تھے۔ مولانا اکبرآبادی صاحب نے فرمایا کہ ان کی ایک بہن تھی۔ ان کے والد ابرار حسین کسی کالرے کے مریض کو دیکھ کر آئے اور بغیر ہاتھ دھوئے لڑکی کو اٹھالیا۔ اس کو کالرا ہوگیا اور وہ مرگئی وہی ایک بیٹی تھی۔ دنیا سے وہ دل برداشتہ ہوگئے اور طے کرلیا کہ مدینہ وہ ہجرت کر جائیں گے۔ جب یہ بات انہوں نے اپنے پیر سے کہی تو وہ بولے صبر کرو۔ اللہ تم کو ایک فرزند سعید عطا کرے گا۔ پھر مولانا کے والد ڈاکٹر ابرار حسین صاحب نے خواب میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کو دیکھا۔ اسی بنا پر طے کرلیا کہ وہ لڑکے کو دیوبند میں تعلیم دلائیں گے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کے والد کا نام ابرار حسین تھا اور آپ کا نام سعید احمد، فرمایا اسی خواب کی بنا پر یہ نام رکھا گیا۔ پھر مولانا بیمار ہوئے اور بچنے کی صورت نہ رہی تو مولانا کے والد نے نذر مانی کہ اگر یہ لڑکا صحت یاب ہوجائے تو اس کو وہ حج کرائیں گے، چنانچہ بہت کم عمری میں مولانا اور ان کی والدہ نے حج کیا۔ فرماتے تھے کہ مکہ سے مدینہ کا سفر اونٹ پر بیٹھ کر کیا۔

کالی کٹ کا قیام! محترم جعفری صاحب فرماتے ہیں کہ وہ کئی برس کالی کٹ ہی رہے۔ وہ صرف ایک سال کالی کٹ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں مقیم رہے۔ (جولائی ۱۹۷۸ء تا مارچ ۱۹۷۹ء) مولانا اکبرآبادی نے فرمایا کہ حکیم عبدالحمید صاحب نے جیسے ہی میرے بارے میں ایک ریمارک کیا۔ میں نے فوراً استعفیٰ دے دیا حالانکہ وہ روک رہے تھے پھر فرمایا کہ میرے پاس تو آپ کی پیش کش موجود تھی۔ میں کالی کٹ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر بن کر آیا تھا۔

کالی کٹ کا بڑا تحفہ ''سیرت عثمانؓ'' ہے، فرماتے تھے کہ بیس برس سے میں کوشش کر رہا تھا سیرت عثمانؓ لکھنے کی مگر کالی کٹ یونیورسٹی کی پُرامن و پُرفضا ماحول میں یہ کام ہوگیا۔ اس کتاب کے سلسلہ میں آپ نے سیرت عثمانؓ کے مقدمہ پر تبصرہ نہیں فرمایا۔ حضرت عثمانؓ کے سلسلہ میں مولانا اکبرآبادی نے عرب مورخین پر ایک عالمانہ مقدمہ لکھا ہے، اس کو الگ سے بھی شائع ہونا چاہیے۔ ان کی آخری کتاب سیرت عثمانؓ ہے نہ کہ خطبات۔

مولانا اکبرآبادی نے فرمایا کہ میں چھ برس مدرسہ فتح پوری میں مدرس رہا اور چھ برس وہ ہمدرد یونیورسٹی میں بھی رہے اور القانون کی دو جلدوں کا ترجمہ انہوں نے عربی سے انگریزی میں کیا۔ فرمایا کہ میں نے اردو طلبہ کے لیے ایک کتاب ''شعلۂ گل'' مرتب کی تھی جو بہت دن مدارس میں چلتی رہی۔ فرمایا کہ جو میرا کتب خانہ تھا وہ قرول باغ میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہوگیا۔ فرمایا کہ بلوائی گھر میں دروازہ سے داخل ہوئے اور میں مع اہل وعیال پچھلے والے دروازہ سے باہر نکل گیا۔ جب سڑک پر پہنچا تو ایک سردار جی تلوار لیے کھڑے تھے اور مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے۔ اللہ کا کرنا کہ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو بولے کہ مولانا آپ تو نکل جائیے اور مولانا مع اہل و عیال نکل گئے اور محفوظ جگہ پہنچ گئے۔

میں آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کلکتہ کی ملازمت چھوڑ دینے سے حضرت مولاناؒ کو

ایک بڑا نقصان ہوا۔ ان کو پنشن نہ کلکتہ سے ملی اور نہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اور خاندان مولانا کا بڑا تھا اس لیے وہ ملازمت کرنے پر مجبور تھے۔ وہ رہتے بڑی شان سے تھے۔ ایک خانساماں اور اس کی مدد کے لیے ایک لڑکا ملازم تھا، میں نے ''مجالس اکبرآبادی'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کردی ہے جو شائع ہورہی ہے، یہ مولانا کے کالی کٹ میں قیام جولائی ۱۹۷۸ء تا مارچ ۱۹۷۹ء کی داستان ہے اور اس کتاب میں تاریخ وار ان کے ملفوظات مرتب کردیے گئے ہیں۔ آیندہ یہ کتاب مولانا کے حالات کا ایک معتبر ماخذ ہوجائے گی۔ ایک سال حضرت مولانا کے ساتھ رہنے کی وجہ سے میں نے یہ معروضات پیش کی ہیں۔

فقط والسلام

(نیازمند) **احتشام احمد ندوی**

مکتوب جلال پور

پوسٹ جلال پور،
ضلع امبیڈکرنگر،
یوپی۔ ۲۲۴۱۴۹
۱۴/ ۳/ ۲۰۱۰ء

عزیز گرامی مولانا عمیرالصدیق صاحب

السلام علیکم۔

فروری ۲۰۱۰ء کے شمارہ ''معارف'' میں مولوی کلیم صفات اصلاحی صاحب کا مضمون ''مولانا ضیاءالدین اصلاحی بحیثیت تبصرہ نگار'' نظرنواز ہوا۔

حضرت مولانا اصلاحیؒ کے معیار ''نقد ونظر'' کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور یہ بات یاد آتی ہے ؏ ''بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا'' کیا کیا حرف گیری اور پھر اس پر کیا کیا

نکتہ رسی قربان جایئے آستانۂ شبلیؒ کے اس مرد قلندر کی علمی بصیرت و آگہی پر - اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے، آمین ۔

''معارف'' کے صفحہ ۳۰۰/ پر اسی مضمون میں ''در یتیم'' مرتبہ احسان احمد خاں بی-اے کی کتاب کا ذکر ہے جس کے بارے میں یہ کہ یہ کتاب ناول کے پیرائے میں لکھی گئی ہے ۔ تو اس ضمن میں عرض ہے کہ میرے پاس ایک کتاب ''در یتیم'' نام کی ہے جو بالکل اسی موضوع و مواد پر ہے (یعنی ذکر رسول اکرمؐ) لیکن اس کے مرتب جناب ماہر القادری ہیں ۔ یہ کتاب بھی بالکل ناول کے انداز میں ہے ۔ اس کتاب کی دیگر تفصیل یہ ہے ۔ مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ دہلی ۶، بار ہشتم (آفسٹ) جنوری ۱۹۸۲ء) ۔

گذشتہ ماہ ۲۲/ فروری کو مبارک پور (اعظم گڈھ) کے نگر پالیکا پریشد کے ہال میں ایک سمینار اردو اکادمی اتر پردیش کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا جس کا موضوع تھا ''جنگ آزادی میں اردو ادب کا حصہ'' ۔ شریک ہونے کا اتفاق ہوا ۔ اس پروگرام میں اکادمی کی چیر پرسن محترمہ ترنم عقیل صاحبہ سے رسمی تعارف کے بعد دوران گفتگو جب یہ معلوم ہوا کہ اسی وقت لکھنؤ واپسی ہے تو میں نے کہا اس وقت علامہ شبلیؒ کے دیار میں آپ کا یہ قافلہ ہے کیا حرج ہے تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی دارالمصنّفین بھی ہولیا جائے تو بتایا یہ گیا کہ دارالمصنّفین میں جلد ہی اکادمی کا ایک پروگرام وغیرہ وغیرہ ۔

''شیخ محمد الغزالی'' کے تحت مضمون پڑھنے کے دوران اس انکشاف پر حیرت ہوئی اور افسوس بھی کہ مصری ادیب نجیب محفوظ کو جو نوبل انعام ملا تھا ان کی مجموعی ادبی خدمات پر نہیں بلکہ عقیدۂ الٰہ پر اعتراض اور نبوت کے انکار پر ملا تھا ۔ استغفر اللہ ۔

والسلام

(خاکسار) فاخر جلال پوری

ادبیات

غزل

محمد خالد عبیدی٭

اے خود اپنی زندگی سے بے خبر تو کون ہے
میں کہ تجھ کو پا رہا ہوں دربدر تو کون ہے
آسماں بھی منتظر ہے تیری آہ سرد کا
یہ زمیں بھی ہے ترے زیر اثر تو کون ہے
اک نئی دنیا بسانے کے لیے اٹھو چلو
کہہ رہا ہے ہم سے یہ بار دگر تو کون ہے
ابتدائے عشق میں آتے ہیں ایسے مرحلے
خیر میں کچھ بھی نہیں ہوں ہاں مگر تو کون ہے
ڈھونڈتا ہے تو خداؤں کے دلوں میں بھی جگہ
چاہتا بھی ہے خدائی سے مفر تو کون ہے
تو محبت سے ملا تو دل یہ چاہا پوچھ لوں
تیرے ایما پر ہے یہ رقص شرر تو کون ہے
کیا اسی کے واسطے پیدا کیا حق نے تجھے
عیب سب میں دیکھتا ہے کم نظر تو کون ہے
موت کی آغوش جب کہ وا ہوئی میرے لیے
جا رہی ہے روٹھ کر اے ہم سفر تو کون ہے

٭ روزنامہ راشٹریہ سہارا، بورنگ روڈ چوراہا، پٹنہ-۱۔

مطبوعات جدیدہ

عہد اسلامی کے ہندوستان میں معاشرت و معیشت اور حکومت کے مسائل: از پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت: ۱۲۰ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱-حوض سوئی والاں، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اسلامی ہند کی تاریخ کا مطالعہ عموماً فتح و ہزیمت اور حکمرانوں کی تہذیبی و ثقافتی دلچسپیوں اور اس سے زیادہ محاسن و معائب کی داستانوں تک محدود رہتا ہے، گو یہ محدود دائرہ بھی وسعت میں کم نہیں ہوتا تاہم ایک طویل عرصے کی اس داستان میں کئی مقامات ایسے بھی ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور اپنے عہد کی نبض ٹٹولنے کے لیے اہم بھی ہیں لیکن دلچسپی اور اہمیت کے باوجود ان پر روایتی تاریخ نویسوں نے توجہ کم کی، مثلاً فنون کے علاوہ علوم اور ان میں بھی قرآن و حدیث، سیرت و فقہ جیسے موضوعات سے سلاطین کا تعلق اور ان کے عہد کے معاشی و معاشرتی و سیاسی مسائل پر ان علوم کے اثرات وغیرہ، زیر نظر کتاب کے فاضل مصنف نے اس گوشے پر خاص توجہ کی اور ایک عرصے سے وہ تاریخ کے اس مدفون خزینے سے معلومات کے بیش قیمت لعل و جواہر سے موجودہ تاریخ کے ایوانوں کو سجاتے رہے ہیں، اس کے لیے انہوں نے فتاویٰ کے مجموعوں کا انتخاب کیا، بظاہر تاریخ کا یہ مصدر نہیں لیکن انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے فقہ و فتاوی کے ان مجموعوں سے اسلامی ہند کی عام معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت کا مستند مرقع پیش کر دیا، ہندو مسلم تعلقات کی اصل حقیقت دیکھا جائے تو ان فتاوی میں موجود ہے، درباروں، سرکاروں سے وابستہ تاریخ نگاروں کی نظر چونکہ ان پر تھی ہی نہیں اس لیے تاریخ نگاری میں حقیقت بھی اسی درجہ دور اور مستور رہی، عہد اسلامی کے ہندوستان میں بیت المال کا تصور اور اس کا دائرہ کار کیا تھا اور تمام باشندگان کے سماجی تحفظ میں اس کا کیا کردار تھا یا ہندوستان کی مفتوحہ آراضی، عشری تھی یا

خراجی یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب کے لیے فقہ وفتاوی کے ہندوستانی مآخذ سے بہت کم اعتنا کیا گیا، فاضل مصنف کو یہ توفیق ملی تو ان کی تحقیقات وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہیں، ایسی چند تحریروں کو اس کتاب کے چھ ابواب کے تحت پیش کیا گیا ہے یعنی عہد سلطنت کے علماء اور سماجی، معاشی وسیاسی مسائل، فقہی کتابیں اور غیر مسلموں سے تعلقات ومعاملات، سندھ میں غیر مسلموں سے محمد بن قاسم کا برتاؤ، بیت المال کا تصور اور کارکردگی، آراضی ہند کی شرعی حیثیت اور ایک باب میں شیخ احمد سرہندی اور اہل حکومت میں شریعت کی ترویج پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، تمام مباحث کا مقصد بھی واضح ہے کہ عہد سلطنت سے عہد مغلیہ تک محیط مسلم حکمرانی میں عوامی مسائل سے علماء بے خبر اور بے تعلق نہیں تھے، ایسا نہیں تھا کہ یہ صرف ایک عام بادشاہی نظام تھا جس میں اسلامی نظام کے قوانین سے قطعی اعراض کیا جاتا رہا ہو اور علماء وفقہاء صرف تماشائی کی حیثیت رکھتے ہوں اور وہ مسائل جو نئے ہندوستانی ماحول کی پیداوار تھے اور جن کے حل کے لیے عوام و خواص دونوں خواہاں تھے، ان کا کوئی حل ان علماء نے پیش نہ کیا ہو، موضوع کی ندرت سے مباحث میں جدت وندرت نے اس کتاب کو وقعت بخشی ہے، اسلامی ہند کی تاریخ سے شغف رکھنے والوں کے لیے اس کی اہمیت ظاہر ہے لیکن فقہ وفتاوی سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بھی اس میں بڑا سامان ہے کہ عہد وسطی کے ہندوستان میں تقلید اور تعصب مسلک میں کیسی نرمی اور رواداری تھی، قریب آٹھ سو سال پہلے ہدایہ اور صاحب ہدایہ کی فروگذاشتوں اور لغزشوں کو پانے کی ہمت اور اس کے اظہار کی جرأت بھی تھی اور اس پر کوئی ہنگامہ بپا بھی نہیں ہوتا تھا۔

دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا تعارف (۱۹۸۰ تک): از ڈاکٹر شباب الدین، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۱۶، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، فلاحی بک ڈپو، اعظم گڈھ، شمیم بک ڈپو، سرائے میر اور فہیم بک ڈپو، مئوناتھ بھنجن۔

دارالمصنفین کو اہل نظر نے سراج منیر کہا کہ اس کے جلووں سے دنیائے علم کسی نہ کسی شکل میں منور ہوئی، دارالمصنفین کو قوم کی بیش بہا دولت کہا گیا کہ اس دولت نے ہندوستان ہی نہیں ایک دنیا کے ادبی وتہذیبی سرمایے میں ایسا اضافہ کیا جو ضروری تھا اور اسی لیے قابل قدر بھی

سمجھا گیا، تاریخ وسیر، فلسفہ وکلام اور تنقید وادب اس کی قلمرو میں ہمیشہ شامل رہے اور نفس مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال اور زبان وبیان کی سلاست اور قلب ونظر کی وسعت کی وجہ سے ممتاز و نمایاں رہے، خصوصاً گذشتہ صدی میں اردو ادب و تنقید کی طوائف الملوکی میں دارالمصنّفین کا خطبہ اور سکہ جس طرح جاری رہا، اس کا مطالعہ و تجزیہ محقق نقادوں کا پسندیدہ موضوع ہے، زیرنظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اب تک کے مطالعات سے کم نہیں، معلومات اور اس سے زیادہ مطالعہ وتجزیہ کے نتائج کے واقعی اظہار نے موضوع سے پورا انصاف کیا ہے، اصلاً یہ فاضل مصنف کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر مسلم یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی، عموماً تحقیقی مقالوں کی اشاعت میں عجلت پسندی نظر آتی ہے لیکن اس مقالہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے قطرے سے گہر ہونے کے مراحل سے گزرنے کی مشکل کو ترجیح دی، حذف واضافہ کی ضرورتوں سے صرف نظر نہیں کیا، دارالمصنّفین کی ادبی خدمات میں مولانا عبدالسلام ندوی کی نگارشات سرفہرست ہیں لیکن اس مقالے میں ان کا ذکر نہیں تو صرف اس لیے کہ فاضل مصنف نے ان کا مفصل جائزہ ایک الگ کتاب میں پیش کردیا ہے، تکرار کی یہ احتیاط مصنف کے ذوق ومزاج کی عکاس ہے اور یہ اس کتاب کے مضامین میں بھی نظر آتی ہے کہ انہوں نے ہر ادبی کاوش کو اس کے زمانہ اشاعت کے مروجہ تنقیدی اصول و نظریات کے مطابق دیکھا اور اسی لحاظ سے اس کی قدر و قیمت متعین کی اس کی بہترین مثال مولانا سید حکیم عبدالحئی کی گل رعنا کا مطالعہ ہے، دارالمصنّفین کی اس کتاب کے متعلق پروفیسر کلیم الدین احمد، عبدالشکور، عبدالقیوم حسرت نعمانی کے محاکموں کا محاکمہ کرتے ہوئے انہوں نے بجا طور پر لکھا کہ صاحب گل رعنا نے یہ دعوی ہی نہیں کیا کہ یہ تنقید یا تذکرہ کی کوئی مرتب کتاب ہے، انہوں نے بڑی سچائی اور سادگی سے صرف یہ کہا کہ ''بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی''، یہ بات پیش نظر ہوتی یا رکھی جاتی تو ہمارے یہ نقاد وہ نہ کہتے جس کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، فاضل مصنف نے دیانت داری سے اس کتاب کی وہ خصوصیات بیان کردیں جن کی معنویت آج بھی اہم ہے جیسے مولانا مرحوم کے وہ تشریحی اشارے جن کو صرف ایک مورخ ہی لکھ سکتا ہے جن میں بعض ایسے اشخاص کے احوال بھی ہیں جن کے بارے میں

دوسروں کو معلومات بہت کم تھیں اور اس سے بڑھ کر انتخاب کلام کی بلند پائیگی اور پھر ان اشعار کی روشنی میں ان کی شاعری پر تبصرہ۔ فاضل مصنف کا یہی تجزیاتی نطقہ نظر مقالات شبلی، مکاتیب شبلی، کلیات شبلی، نقوش سلیمانی، حیات شبلی، حیات سلیمان اور غالب مدح وقدح کی روشنی میں جیسی ادبی کتابوں کے لیے بھی خاص ہے، ایک اچھی بحث رسالہ معارف پر بھی ہے، شروع میں دارالمصنّفین کے قیام وتاسیس کا جامع مطالعہ بھی ہے، کہیں کہیں شکوہ بھی ہے اور یہ زیر لب نہیں برملا ہے، خصوصاً حیات سلیمان کے تعلق سے شاہ معین الدین ندوی کے ذکر میں تلخی سی آ گئی ہے، اس کے لیے جواب شکوہ کی ضرورت ہے، ان کو یہ بھی احساس ہے کہ دارالمصنّفین نے وقت کے ساتھ بدلنے کی کوشش نہیں کی جس سے اس کی ادبی سیادت ہاتھوں سے جاتی رہی، یہ خیال جس طرح محل نظر ہے اسی طرح قابل بحث بھی ہے، لیکن خوبی یہ ہے کہ تنقیدی راست گوئی نے لب و لہجہ کے اعتدال وتوازن سے ہم آہنگی ہاتھ سے نہیں جانے دی، معارف کے لیے اجتہادی روش اپنانے کے مشورے میں نیک نیتی ہے۔ دارالمصنّفین کی خدمات سے واقفیت اور اس پر مزید مطالعہ وتحقیق کے لیے اس کتاب کی افادیت میں کوئی شبہہ نہیں۔

خواتین ٹمل ناڈو کی دینی علمی وادبی خدمات: از جناب علیم صبا نویدی،

مرتبہ ڈاکٹر جاوید ہ حبیب، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات ۱۶۴، قیمت: ۴۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ممبئی، علی گڑھ اور دیگر مشہور مکتبے۔

تامل ناڈو میں اردو کے بنیادی موضوع پر مبسوط، مفصل اور جامع کام کرنے والوں میں سب سے ممتاز اور سب سے نمایاں اور غالباً تنہا ومنفرد نام سے اردو دنیا میں صرف ایک شخصیت معروف ہے اور وہ ہیں جناب علیم صبا نویدی، تاریخ، تذکرہ، نثر، نظم جیسے موضوعات پر ان کی کتابوں کی کمیت وکیفیت گویا ناقابل یقین حد تک قابل رشک ہے اور اس لیے بھی کہ یہ صلہ وستایش سے بے نیاز، محض اردو زبان کی محبت وخدمت کے جذبے سے ہے، ادھر ان کی صحت نے ان کے جذبوں اور حوصلوں کا ساتھ دینا کم کیا تو قدرت نے ان کو ان کی صاحب زادی کی شکل میں نئی قوت عطا کر دی جو اپنے والد کے مضامین اور مسودات کو مرتب کرنے میں سعید اولاد کی معنویت کو بابرکت بنا رہی ہیں، اس کتاب میں تامل ناڈو کی پچاس سے زیادہ ایسی خواتین کا

نام اور کام پیش کیا گیا ہے جو اردو دنیا کے قابل قدر سرمایہ ہونے کے باوجود گم نامی کے حجاب میں تھیں، انیسویں صدی سے اب تک ان خواتین کی ادبی کاوشوں کا ذکر محض ایک ذکر ہی نہیں اردو کی جہاں گیری کی داستان بھی ہے، آج سے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے اشیمہ آرکاٹی کی مثنویاں زبان و بیان کی قدرت کا کرشمہ ہیں، ان خواتین کے نام نیک کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہ کتاب واقعی ہر تحسین کے لائق ہے، البتہ کمپوزنگ کی غلطیاں بہت ہیں، کاش کوئی لائق مصحح بھی اردو ادب کے ان خدمت گذاروں کو مل جاتا۔

نقد و نوا: از ڈاکٹر آفاق فاخری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع خوب صورت گرد پوش، صفحات ۱۴۴، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر آفاق فاخری، محلّہ قاضی پورہ، جلال پور، امبیڈکر نگر۔

فکر اقبال کے سرچشمے، کتاب آئی تو ایک شاعر کے نثر نگار ہونے کی بشارت لائی، اب پیش نظر کتاب میں نظیر و غالب، اقبال و اکبر، چکبست و فانی، ساحر و منٹو و وامق، آسی و نادم بلخی، اختر بستوی اور جاوید وشسٹ کی شاعری، فکر و فلسفہ، شخصیت، انفرادیت کے دلچسپ مضامین نے آفاق فاخری کی نوائے تنقید کی لے بھی تیز تر اور خوب تر بنانے کی خوب صورت تصویر پیش کردی ہے، لائق مصنف کی نظر میں یہ طالب علمانہ جستجو و تلاش کے سوا کچھ اور نہیں لیکن غالب و اقبال کے ساتھ ساحر و وامق کے ذہن و مزاج کی مختلف بلکہ متضاد لہروں کو گننا اور ان کی رفتار متعین کرنا اتنا آسان نہیں لیکن نظر و فکر کی اصابت و سلامت، ساتھ ہو تو تنقید کے یہ سخت مراحل بھی آسان ہو جاتے ہیں، اس کتاب کے مضامین کی بڑی خوبی یہی ہے، توقع ہے کہ جس طرح شاعر آفاق فاخری کو قبولیت عام حاصل ہے، نقاد ادیب کی حیثیت سے بھی وہ بلندیوں کے حصول میں کامیاب ہوں گے۔

ع - ص